سلسلہ مطبوعات: ۳۴۰

خطبات

مسلم پرسنل لا بورڈ

(یعنی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس کے صدارتی خطبات کا مجموعہ)

از

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ

پہلا ایڈیشن

ربیع الاول ۱۴۳۱ھ - مارچ ۲۰۱۰ء

نام کتاب	:	خطبات مسلم پرسنل لا بورڈ
نام مصنف	:	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
صفحات	:	۱۶۰
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
کمپوزنگ	:	(حشمت علی) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام
طباعت	:	کاکوری آفسیٹ پریس، لکھنؤ
قیمت	:	۷۵/روپے

طابع وناشر

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

پوسٹ باکس نمبر ۱۱۹، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فون نمبر:0522-2741539، فیکس نمبر:0522-2740806

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد!

ہندوستان میں دوصدی قبل تک مسلمانوں کی حکومت تھی اس طرح شریعت اسلامی کے تحفظ کی کوئی بڑی ذمہ داری تنہا علماء اوردانشوروں پر نہیں تھی اور جتنی ذمہ داری تھی اس میں ان کوحکومت کی سرپرستی سے تقویت حاصل تھی، لیکن بعد میں تنہا مسلمانوں پر یہ ذمہ داری آگئی کہ وہ اپنے دین کی حفاظت اورشریعت اسلامی کے نفاذ کی پوری فکر کریں، چنانچہ نفاذ شریعت کی اہمیت بتانے اوردین پرعمل کرنے کی طرف توجہ دلانے کا کام امت کے علماء نے مدارس اورادارے قائم کرکے انجام دینا شروع کردیا جوالحمد للہ ہندوستان سے غیرملکی حکومت کے ختم ہونے کے بعدبھی جاری ہے کیونکہ ملک غیرمسلم اکثریت کا ہے اگرچہ حکومت غیرمذہبی ہے لیکن اسی درمیان میں غیرمسلم اکثریت کے بعض لیڈروں نے ملک میں دوسرے مذاہب کے مذہبی قوانین کوتنہا ایک ملکی قانون میں ضم کردینے کی بات چلائی جس کے سبب شریعت اسلامی کے تشخص اورتحفظ کے ختم ہوجانے کا خطرہ سامنے آیا،اس مسئلہ پرتوجہ دینے کے لیے آج سے ۳۸ سال قبل مسلمان علماء اوردانشورجمع ہوئے تھے،انھوں نے اپنی جمہوری بنیاد پراوردستورہند سے حاصل شدہ اختیارات کے ذریعہ اس کے مقابلہ کا نقشہ بنایا جوآل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صورت میں عمل میں آیا اس کی پہلی صدارت ملک کے سب سے بڑے دینی ادارے دارالعلوم دیوبند کے مہتمم نے کی ان کی وفات کے بعدندوۃ العلماء لکھنؤ کے سربراہ مولانا سیدابوالحسن علی ندوی کوصدارت سپرد کی گئی، انہوں نے پوری توجہ سے اس کی ذمہ داری سنبھالی،

اور بورڈ کے اہم روح رواں اور سکریٹری جنرل حضرت مولانا شاہ سید منت اللہ رحمانی کی رفاقت میں اپنی ذمہ داری کی ادائیگی کا فرض انجام دیا، اس سلسلہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سالانہ جلسوں میں خطبۂ صدارت کے ذریعہ شریعت اسلامی کے تحفظ کی اہمیت اوراس کو خطرات سے بچانے کی ضرورت کو اچھے علمی اور تشریحی انداز میں پیش کرتے تھے، یہ وقتی طور پر پمفلٹ کی شکل میں شائع ہوتے رہے ان میں جو اہم باتیں پیش کی گئیں ان کی اہمیت کا تقاضا یہ محسوس کیا گیا کہ وہ صرف وقتی فائدہ دے کر ختم نہ ہوجائیں بلکہ ان کا فائدہ قائم رہے، اس لیے ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' نے طے کیا کہ ان میں اہم خطبات کو کتابی شکل میں جمع کر دیا جائے تاکہ ان کا فائدہ قائم رہے اوران کو پڑھ کر تحفظ شریعت کی ذمہ داری کو وہ حضرات جن کو اللہ تعالیٰ نے کچھ کرنے کی صلاحیت دی ہے وہ رہنمائی حاصل کریں اور ملت کو دین سے وابستہ کرنے کی جو کوشش ہوسکتی ہے وہ کریں، تاکہ یہ امت صحیح طور پر امت مسلمہ اور خیر امت بننے کی سعادت حاصل کرسکے۔

اللہ تعالیٰ اس کی اشاعت کو مفید فرمائے اوراس عمل کو قبول فرمائے۔آمین

محمد رابع حسنی ندوی
ندوۃ العلماء، لکھنؤ

جمعہ، ۲۵/ربیع الاول ۱۴۳۱ھ

مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام

ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے اپنے تشخصات کے وجود و بقا کے لئے بلکہ مذہب کے دائرہ میں رہتے ہوئے آزادانہ زندگی گزارنے کے لیے ایک دوسرا خطرہ نمودار ہوا، اور وہ حکومت کا یہ رجحان اور خود مسلمانوں کے تجدد پسند اور آزاد خیال طبقہ کا یہ مطالبہ تھا کہ ہندوستان میں سارے فرقوں کا ایک مشترک عائلی قانون (Uniform Civil Code) ہونا چاہئے کہ اس کے بغیر قومی وحدت اور یک رنگی نہیں پیدا ہوسکتی، یہ خطرہ اندیشہ سے بڑھ کر واقعات کی شکل میں سامنے آنے لگا، حکومت کے بعض محتاط لیکن معنی خیز بیانات وقتاً فوقتاً اس اندیشہ کو تقویت پہونچاتے تھے، پھر عبدالحمید دلوائی صاحب کی قیادت میں ایک طبقہ پیدا ہوگیا تھا، جو وقتاً فوقتاً اس کا مطالبہ کرتا تھا، اور ایک مہم اور تحریک کی طرح اس کو چلا رہا تھا، یہ مسلمانوں کے تہذیبی، معاشرتی ارتداد اور شریعت اسلامی سے بغاوت اور اس کے برکات سے محرومی کا پیش خیمہ اور "وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ" (۱) (اور جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے لوگ کافر ہیں) کی وعید کا مصداق بنانے والا تھا۔

اس خطرہ کا احساس جن لوگوں کو ہوا، ان میں مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ پیش پیش تھے، ان کے اس منصب و مشاغل اور علمی تجربات نے اس سلسلہ میں بروقت رہنمائی کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف محاذ قائم کرنے کی سعادت (دوسروں سعادتوں کے ساتھ) ان کے لیے مقدر فرمائی، اور انھوں نے اس کے خلاف ایک منظم مہم اور تحریک چلانے اور ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا، مسلم مجلس مشاورت، جماعت اسلامی، دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم، اور ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے

والے علماء نے اس کی پوری تائید کی اور طے ہوا کہ ۲۷، ۲۸ / دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں مسلم پرسنل لاکنونشن بلایا جائے، جس میں مسلمانوں کے مختلف مکاتب خیال، مذہبی گروہوں اور فرقوں کو دعوت دی جائے، اور ان کی نمائندگی اور تعاون سے اس فتنہ کے خلاف مضبوط متحدہ محاذ قائم اور ایک ادارہ وجود میں لایا جائے، میں اور مولانا محمد منظور صاحب اس سال رابطہ کے اجلاس میں شرکت کے لیے جو ذی قعدہ میں ہوا کرتا تھا، حجاز مقدس گئے ہوئے تھے، اور قدرتاً حج سے فراغت کے بعد واپسی کا پروگرام تھا، لیکن مولانا محمد یوسف صاحب (جماعت اسلامی) اور بعض دوسرے احباب کے تار و پیغام پہونچے کہ اس بنیادی جلسہ اور پہلے کنونشن میں آپ دونوں کی شرکت ضروری ہے، ہم لوگوں نے اس خیال سے کہ یہ مسئلہ مسلمانوں کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے کئی بار حج کی سعادت نصیب فرمائی ہے، اور آئندہ بھی اس سے توقع ہے، حج میں صرف ۲-۳ ہفتے کی مدت رہ گئی تھی، کہ ہم لوگوں نے براہ بیروت بمبئی کا سفر کیا، اور کنونشن میں شریک ہوئے، ملت اسلامیہ ہندیہ کی ایسی مکمل نمائندگی اس سے پہلے کم دیکھنے میں آئی تھی، شرکاء میں بریلوی مکتب خیال کے عالم وقائد مولانا برہان الحق جبل پوری، اثنا عشری فرقہ کے نمائندہ مولانا کلب عابد صاحب، بوہرہ فرقہ کے نمائندہ اور ذمہ دار ڈاکٹر نجم الدین، اہل حدیث حضرات کے متعدد مقتدر علماء و زعماء شریک تھے، رات کو مدن پورہ کے وائی، ایم، سی، اے کے میدان میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا، جس میں ایک لاکھ کے قریب مجمع ہوگا، متعدد عالمانہ و مفکرانہ تقریریں ہوئیں، بمبئی بلکہ مہاراشٹر کے مسلمانوں نے بڑی گرم جوشی سے اس مقصد کے ساتھ تعاون کیا، اور بڑی فراخ دلی سے میزبانی کے فرائض انجام دیئے، ایک آل انڈیا بورڈ کی تشکیل ہوئی جس کے صدر بالاتفاق حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، اور جنرل سکریٹری مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی قرار پائے، اور اس طرح اس مبارک مہم کا آغاز ہوا جو مسلمانوں کے لیے (دینی و شرعی نقطۂ نگاہ سے) موت و حیات کا مسئلہ ہے، اور یہ جد و جہد ابھی تک جاری ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ

خدمات اور اقدامات

شریعت اور مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے لیے اولین بنیادی اوراہم ترین مسئلہ کی اہمیت رکھتا ہے جس کے بارہ میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے، اور ہندی انگریزی پریس کی طرف سے اس کی تائید اور بعض تجدد پسند مسلمانوں کی بیجا حمایت ووکالت نے بہت سے خطرات وخدشات پیدا کردیئے ہیں اور شریعت اسلامیہ اور مسلم پرسنل لا پر جارحانہ حملوں نے مسلمانوں کے احساسات وجذبات کو مجروح اور انھیں غم وغصہ میں مبتلا کردیا ہے جس کا اظہار ملک گیر پیمانے پر "مسلم پرسنل لا بورڈ" کی مہم اور اجتماعات اور احتجاج ومظاہرے سے ہوتا ہے اور جن میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔

مسئلہ کی اہمیت ونزاکت اور وقت کی اس اہم ترین ضرورت کے پیش نظر ندوۃ العلماء کے ایک ممتاز فاضل اور منجھے ہوئے صحافی مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی نے ممتاز عالم دین واسلامی مفکر اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ سے یہ تفصیلی انٹرویو لیا اور حضرت مولانا نے ذاتی پریشانیوں اور سیلاب کی تباہ کاریوں میں گھرے ہونے کے باوجود اپنے روایتی ایثار سے کام لیتے ہوئے اس اہم ملی مسئلے کی اہمیت وضرورت پر تفصیل سے روشنی ڈالی، مسلم پرسنل لا بورڈ کی گذشتہ خدمات اور آئندہ اقدامات کے بارے میں بتایا اور اپنی صاف گوئی اور دوراندیشی وفراست سے کام لیتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کی بعض کمزوریوں کی طرف بھی متوجہ کیا، اس طرح یہ انٹرویو "مسلم پرسنل لا" کے تعارف کے ساتھ اس کی پُرزور، مؤثر اور معقول ومدلل وکالت کا کام بھی بخوبی انجام دے گا اور اس عظیم مقصد کو مدد وتقویت دے گا۔

اللہ تعالیٰ اسے ہر طرح مبارک فرمائے اور ملت اسلامیہ ہندیہ کو اس سے نفع پہنچائے۔

شمس تبریز خاں
رفیق مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ

۲۶ر صفر ۱۴۰۶ھ
۱۰ر نومبر ۱۹۸۵ء

سوال:۔آپ نے اپنے سیاسی خیالات، علمی ودینی مشاغل کی سرگذشت اور ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق بعض ایسے اہم انٹرویو دیئے ہیں، جو اس ملک میں ملّی اوردعوتی جدوجہد کی تاریخ میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ پر قلم اٹھانے والا کوئی مؤرخ ان کو نظر انداز نہیں کرسکتا، مثال کے طور پر فروری ۱۹۷۱ء میں ''ندائے ملت'' کے لیے آپ نے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت، اس کے بعد تحریک ''پیام انسانیت'' کے متعلق تفصیلی انٹرویو دیئے جن سے بہت سے حقائق آشکارا ہوئے، اب ہم پھر آنجناب کو ایک ایسے مسئلہ پر بعض وضاحتوں کی زحمت دینا چاہتے ہیں، جس نے کچھ عرصہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے دل ودماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، ہماری مراد مسلم پرسنل لا سے ہے، لیکن مسلم پرسنل لا سے متعلق بعض اہم مسائل پر گفتگو سے قبل ہم اس بورڈ کی صدارت کے بارے میں سوال کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ آپ نے مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت اپنے مخصوص مزاج اور غیر معمولی علمی ودعوتی مصروفیات، نیز سابقہ روایات کے خلاف کیوں قبول کی، جب کہ اس سے پہلے (جہاں تک ہمیں یاد ہے) مسلم مجلس مشاورت کی صدارت آپ نے ڈاکٹر سید محمود صاحب جیسی محترم شخصیت کے اصرار پر بھی قبول نہیں فرمائی، آخر اس کے اسباب کیا ہے؟

جواب:۔آپ نے ایک اچھی تمہید کے بعد جس نے مجھے واقعات کی بعض بھولی ہوئی کڑیاں یاد دلا دیں اور ایک مناسب انداز کے ساتھ مجھ سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت قبول کرنے کے بارے میں سوال کیا ہے، واقعہ ہے کہ میری افتادِ طبع، خاندانی روایات اور مشاغل کی نوعیت سے جو لوگ واقف ہیں، ان کو اس بارے میں ضرور ایک تضاد سا محسوس ہوتا ہے۔

جن لوگوں کو میرے مضامین ورسائل اور کم سے کم سرگذشت حیات ''کاروان زندگی'' پڑھنے کا موقع ملا ہے، وہ جانتے ہیں کہ میں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے

اجتماعی اور تنظیمی کاموں میں سے دو کاموں کی سب سے زیادہ اہمیت محسوس کی ہے، اور یہ ملت اسلامیہ کی روح، مزاج، اس کے مقاصد و پیغام سے کسی حد تک واقفیت اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کے گہرے مطالعے کا نتیجہ ہے۔

(۱) ایک ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ نسل کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت اور ان کے معنوی اور روحانی تسلسل کو برقرار رکھنے اور نہ صرف ذہنی اور تہذیبی بلکہ (خاکم بدہن) اعتقادی ارتداد سے بچانے کے لیے مسلمان بچوں کی تعلیم کا انتظام اور ان کی طرف اسلامی ورثہ کی منتقلی اور ان کو اس کا حامل ومحافظ بنانے کی جدوجہد۔

(۲) دوسرے اس ملت کو ہندوستان جیسے ملک میں (جو مذاہب، تہذیبوں اور قومیتوں کا گہوارہ ہے) اپنے ملّی تشخص کے ساتھ اور ایک ایسی صاحب شریعت ملت کی حیثیت سے باقی رکھنے کی جدوجہد، جس کا رشتہ آسمانی تعلیمات اور الٰہی قانون کے ساتھ استوار ہے، اور جس کے یہاں دین کا مفہوم عقائد وعبادات کے دائرہ میں محدود نہیں، پوری زندگی پر حاوی ہے، اور جو اپنا مستقل عائلی (خاندانی) نظام وقانون رکھتی ہے، جو اس کے دین کا جزء اور کتاب وسنت کے صریح احکام وہدایات پر مبنی ہے، اور ایک مسلمان کے لیے اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

اس احساس وشعور اور فکر ومطالعہ کا نتیجہ ہے کہ جب ۱۹۵۹ء کی آخری اور ۱۹۶۰ء کی ابتدائی تاریخوں میں قاضی محمد عدیل عباسی صاحب مرحوم کی دعوت پر بستی میں صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی اور اجلاس کی صدارت کا قرعۂ فال میرے نام نکلا تو میں نے بلا تکلف اس کو قبول کیا پھر جب اس کی مستقل صدارت کے لیے میرا انتخاب ہوا، تو میں نے ادائے فرض کے اس احساس سے اس ذمہ داری کو قبول کیا، اور ابھی تک ایک سعادت وعبادت سمجھ کر اور کم سے کم ہندوستان میں اس کو ایک اہم خدمات باور کر کے اس ذمہ داری کو نباہ رہا ہوں۔

یہی حال مسلم پرسنل لا بورڈ کے مسئلہ کا ہے، ملک کی آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک دوسرا خطرہ نمودار ہوا، وہ حکومت کا یہ رجحان اور پھر مسلمانوں کے

ایک تجدّد پسند اور آزاد خیال گروہ کا یہ مطالبہ تھا کہ ہندوستان میں سارے فرقوں کا ایک مشترک عائلی قانون (Uniform Civil Code) ہو کہ اس کے بغیر قومی وحدت اور یک رنگی نہیں پیدا ہو سکتی، یہ خطرہ اندیشہ سے بڑھ کر واقعہ کی شکل میں سامنے آنے لگا، خود حکومت کے بعض محتاط لیکن معنی خیز، بیانات وقتاً فوقتاً اس اندیشہ کو تقویت پہونچاتے تھے خود مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جو ایک مہم اور تحریک کی طرح اس کو چلا رہا تھا، یہ مسلمانوں کے تہذیبی اور معاشرتی ارتداد اور شریعت اسلامی سے بغاوت اور اس کے برکات سے محرومی کا پیش خیمہ اور" ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئك هم الکافرون" (اور جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ کافر ہیں) کی وعید کا مصداق بنانے والا فتنہ تھا۔

اس خطرہ کا احساس جن لوگوں کو ہوا، واقعہ یہ ہے کہ ان میں مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ پیش پیش تھے، انھوں نے ہر وقت رہنمائی کی اور اس کے خلاف ایک منظّم مہم اور تحریک چلانے اور ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا، طے ہوا کہ ۲۷/۲۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں مسلم پرسنل لا کنونشن بلایا جائے، میں اور رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی اس سال رابطۂ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے (جو ماہ ذیقعدہ میں ہوا کرتا تھا) حجاز مقدس گئے ہوئے تھے، اور قدرۃً حج سے فراغت کے بعد واپسی کا پروگرام تھا، لیکن مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ہم لوگوں نے ایسے وقت ہندوستان آنے کا فیصلہ کیا جب حج میں صرف پندرہ بیس دن باقی تھے، اور بمبئی کنونشن میں شرکت کی، یہاں اس ادارہ کے قیام کی تاریخ اور تفصیلات کا بیان کرنا مقصود نہیں، صرف دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

ایک یہ کہ ملت اسلامیہ ہندیہ کی ایسی مکمل نمائندگی اس سے پہلے کم دیکھنے میں آئی تھی، جیسی اس کنونشن کے موقع پر نظر آئی، دوسرے یہ کہ اس اجلاس کے نتیجہ میں ایک آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی جس کے صدر بالاتفاق حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم اور جنرل سکریٹری مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی قرار پائے۔

قاری صاحب مرحوم (جن کو اللہ تعالیٰ نے ایک دلآویز اور ہمہ گیر شخصیت عطا فرمائی تھی) کی صدارت کی موزونیت پر تقریباً سب کا اتفاق تھا، رانچی کے سالانہ اجلاس ۱۹۷۷ء کے موقع پر صدارت میں تبدیلی کا مسئلہ زورشور سے اٹھا، بعض حلقوں کی طرف سے میرا نام پیش کیا گیا، لیکن میرے یہ کہنے پر سب خاموش ہوگئے کہ ''طوفان میں کشتی نہیں بدلی جاتی'' میرے لیے اس کا ایک بڑا محرک یہ بات بھی تھی کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب جیسا باوقار اور ہردلعزیز صدر ملنا مشکل ہے، اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسے مشترک ادارہ کی صدارت کے لیے وہی موزوں ہیں، لیکن ۱۷/جولائی ۱۹۸۳ء کو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اس دارِ فانی سے رحلت کی اور ان کی جگہ خالی ہوگئی، اس سال ۲۸/۲۹/دسمبر ۱۹۸۳ء میں مدراس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سالانہ اجلاس کا ہونا طے پایا، میں اپنے بعض بیرونی پروگراموں اور خرابیِ صحت کی بنا پر اس سے پہلے کے عاملہ کے بعض اجلاسوں میں شرکت نہیں کرسکا تھا، اس اجلاس میں شرکت کا عزم مصمم تھا، اور سفر کے سب انتظامات کر لئے گئے تھے کہ عین موقع پر مجھ پر نقرس (Gout) کی بیماری (جس کا میں پرانا مریض ہوں) کا شدید حملہ ہوا اور میں اپنے وطن رائے بریلی میں ایسی شدید تکلیف میں مبتلا ہوا کہ چارپائی سے اترنا مشکل تھا، مجبوراً سفر کے التواء کا فیصلہ کرنا پڑا، اجلاس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا نام صدر کی جگہ کے لیے پیش کیا گیا جو لوگ میری طبیعت سے واقف ہیں، انھوں نے یہ کہا کہ وہ صرف اس صورت میں منظور کرسکتے ہیں کہ متفقہ طور پر ان کا انتخاب عمل میں آئے، مجھے معلوم ہوا کہ بغیر کسی اختلاف کے میرا نام منظور ہوا، جب مجھے اس کی اطلاع ہوئی تو ''سنگ آمد وسخت آمد'' کا مضمون تھا، یہ فیصلہ میری افتادِ طبع، صحت جسمانی، عمر اور دوسری ذمہ داریوں اور مشغولیتوں سے میل نہیں رکھتا تھا، اگر یہ کسی بھی سیاسی، ملی تنظیم اور باعث افتخار واعزاز منصب کے قبول کرنے کا معاملہ ہوتا تو میں بغیر کسی ادنیٰ تردّد کے انکار کردیتا، لیکن ایک تو مسئلہ کی نوعیت واہمیت کی وجہ سے جس کو میں اپنے عقیدہ کا جزء اور مسلمانوں کی ملی زندگی کے لیے شہ رگ کا درجہ دیتا ہوں،

دوسرے مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کے احترام کی بنا پر جن کا بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے فرزند ہونے کی وجہ سے ہمیشہ لحاظ کرتا رہا ہوں، چاروناچار قبول کرنا پڑا، دوستوں کی اس بات کو بھی اس میں دخل تھا کہ اس وقت بورڈ کو اختلاف وانتشار سے بچانے کے لیے بھی ایسا کرنا ضروری ہے، چنانچہ فارسی کے اس پرانے شعر پر عمل کرنا ہی پڑا۔

رشتۂ درگردنم افگندہ دوست
می برد ہرجا کہ خاطر خواہ اوست

مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے صدارت قبول کرنے کے کچھ عرصہ بعد ہی نہ صرف بورڈ کی تاریخ میں بلکہ ملت اسلامیہ ہندیہ کی تاریخ میں ایسے سنگین مرحلے پیش آئیں گے جو شاید اس سے پہلے پیش نہیں آئے اور جن میں قیادت کے غیر معمولی حزم وعزم، ملت کے نظم وضبط، علمائے دین وماہرین قانون کے علم ومطالعہ، ذہانت وتدبّر اور عوام کے انقیاد واطاعت، صبر وتحمل، قائدین پر اعتماد اور تفویض وتسلیم کی غیر معمولی صلاحیت کے ثبوت دینے اور ملی شعور کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، میرا اشارہ خاص طور پر نفقۂ مطلقہ کے بارے میں سپریم کورٹ کے اس ہنگامہ خیز فیصلہ کی طرف ہے، جو ۲۳؍اپریل ۱۹۸۵ء میں دیا گیا، اور جس نے ملت کو اپنے دین وشریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری اور غیرت وخودداری کے ایک فیصلہ کن مرحلے پر لا کھڑا کردیا، تدبیر الٰہی کی کارفرمائی تھی (جس کی حکمتوں کو کوئی نہیں جانتا) کہ یہ نازک اور فیصلہ کن مرحلہ (جو اگر کامیابی کے ساتھ گزار لیا گیا اور ملت نے اس میں فتح حاصل کرلی تو عرصۂ دراز تک کے لیے انشاء اللہ مسلمانوں کا عائلی قانون عدالتوں کا تختۂ مشق بننے سے بچ جائے گا) مجھ ناتواں کے دورِ صدارت میں پیش آیا، جو سخت جسمانی جدّ وجہد، قوت برداشت اور فرصت وفراغت کا طالب ہے، شاید یہ بات غیرت الٰہی اور رحمت الٰہی دونوں کو حرکت میں لانے کا باعث بن جائے جن کے بغیر اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے قائدین، اور اولوالعزم

مصلحین بھی کوئی کامیابی حاصل نہیں کرسکتے "وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِاللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ" (نصرت تو بس زبردست اور حکمت والے اللہ ہی کی طرف سے ہے)۔

سوال:۔ کیا آپ مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لیے بورڈ کی اب تک کی کارگزاری پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

جواب:۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس اس سال اپریل ۱۹۸۵ء میں کلکتہ میں ہوا تھا، بورڈ کے اس جلسہ میں اس کی سابقہ روایات کے مطابق مسلمانوں کے مختلف حلقوں کی نمائندگی تھی، اور تقریباً تمام مسلم جماعتیں اور تنظیمیں اور مکاتب فکر اور مذہبی فرقے شامل تھے، میرا خطبہ زبانی تھا جو اردو اور انگریزی میں چھپ گیا ہے، اور جس میں مسئلہ کی اہمیت اور نوعیت پر اصولی اور علمی اور حقیقت پسندانہ انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے، آخری اجلاس شہید مینار چوک میں ہوا، جس میں محتاط اندازہ کے مطابق ۵ لاکھ انسان تھے، میں نے ضرورت سمجھی کہ اس میں خاص طور سے مسلمانوں کو مخاطب کیا جائے اور خود ان کا دینی اور عملی احتساب کیا جائے کہ وہ خود قانون خداوندی پر کتنا عمل کرتے ہیں، انھوں نے اس کے بارے میں جو رویہ اختیار کر رکھا ہے، اس کا غیبی اور اخلاقی اثر کیا پڑ رہا ہے، یہ خطبہ بھی چھپ گیا ہے۔

اس کے بعد دہلی میں عاملہ کے دو اجلاس ہوئے، پہلا اجلاس ۱۴ رمئی اور دوسرا اجلاس ۱۰ رجولائی کو دہلی میں ہوا جس میں وزیر اعظم راجیو جی سے بورڈ کے ایک نمائندہ وفد کا ملنا طے ہوا............۳۰ رجولائی ۱۹۸۵ء کو وفد نے وزیر اعظم کو یادداشت پیش کی اور اس کے بعد ایک مفصل نوٹ جو بہت غور و فکر اور مشورہ اور تبادلۂ خیال کے بعد مرتب ہوا تھا، پیش کیا گیا، جس میں ان کے لیے مسئلہ کو سمجھنے کے لیے پورا مواد اور ضروری معلومات فراہم کی گئی تھیں، اور یہ کہ اب ان کے لیے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے کون سا دستوری اور عملی آسان راستہ ہو سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اتنا اور کہتا چلوں کہ میں نے بحیثیت صدر کے گفتگو کا آغاز کرتے

ہوئے کہا کہ راجیو جی! میری عمر اب ۷۲، ۷۳ سال کی ہو رہی ہے، میں نے آپ کے نانا موتی لال جی کو بھی دیکھا ہے، اور ان کی تقریر امین آباد پارک لکھنؤ میں سنی ہے، اور جواہر لال اور اندرا جی کو تو بہت قریب سے دیکھا ہے، اور ان کا اچھا زمانہ پایا ہے، لکھنؤ میں رہنے اور خاص طرح کے خاندانی اور تعلیمی ماحول کی وجہ سے تحریک خلافت اور تحریک آزادی سے لے کر ایسی کوئی تحریک نہیں تھی، جس کا میں نے قریب سے مطالعہ نہ کیا ہو، اور اس کے اثرات نہ دیکھے ہوں، میں اپنی اس طویل واقفیت کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کسی مسئلہ پر کم سے کم مسلمانوں کے ہر مکتب خیال، سیاسی جماعتوں، پارٹیوں اور تنظیموں اور افراد کا ایسا مکمل اتحاد و اتفاق دیکھنے میں نہیں آیا، جیسا کہ مسلم پرسنل لا کے تحفظ پر عمومیت کے ساتھ اور سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کے خلاف خصوصیت کے ساتھ دیکھنے میں آرہا ہے، راجیو جی نے یہ باتیں غور سے سنیں اور ان پر کوئی جرح نہیں کی، پھر دوسرے معزز ارکانِ وفد نے (جن میں جناب غلام محمود بنات والا، سید شہاب الدین اور الحاج ابراہیم سلیمان سیٹھ زیادہ نمایاں تھے) مسئلہ پر روشنی ڈالی اور پُر مغز طریقہ پر اس کی وکالت کی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے جب رمضان المبارک میں جمعۃ الوداع کو یوم تحفظ شریعت منانے کا فیصلہ کیا تو پورے ملک میں بڑے وقار و احترام اور کسی نعرہ بازی اور ہنگامے کے بغیر یہ دن منایا گیا، مساجد میں تقریریں کی گئیں، اور وزیر اعظم اور وزیر قانون کو احتجاجی ٹیلی گرام اس کثرت سے روانہ کئے گئے کہ اس سے پہلے شاید ایسا ہوا ہو، اسی طرح جب تحفظ شریعت کا ہفتہ منانے کا فیصلہ کیا گیا تو مسلمانوں کے مختلف مسلک رکھنے والی جماعتوں اور مکاتب فکر نے تحفظ شریعت کا ہفتہ منانے میں کسی جماعتی عصبیت کا مظاہرہ نہیں کیا، انھوں نے اس موقع پر مکمل ہم آہنگی، اتحاد، جذبۂ تعاون اور ملی غیرت و حمیت کا ایسا ثبوت دیا ہے اور دے رہے ہیں جس کی تمنا عرصہ سے تھی، اور اگر یہ کہوں تو بے جا بات نہ ہوگی کہ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ نے مسلمانوں کے اندر اتحاد و یکجہتی پیدا کرنے کا ایسا کام کیا جو شاید بڑی جدوجہد کے بعد بھی اس طرح انجام نہ پایا ہوتا،

تحفظ شریعت کا ہفتہ بہار واڑیسہ اور یوپی میں منایا جاچکا، دوسری ریاستوں میں باقی ہے(۱) ہر جگہ جلسے غیر معمولی طور پر کامیاب رہے، اور سالہا سال کے بعد مسلمانوں میں وہ جوش وخروش جلسوں میں حاضرین کی تعداد اور کام کرنے والوں میں ہم آہنگی دیکھنے میں آئی جس کا مشاہدہ برسوں سے نہیں ہوا، کانپور کے جلسہ میں لوگوں کا اندازہ پچاس ہزار سے ایک لاکھ تک کے درمیان تھا، مرادآباد میں بھی ہزاروں کی تعداد تھی۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسئلہ اپنے مخصوص موضوع ومقصد (تحفظ شریعت) اور مشترک عائلی قانون کی مخالفت کے علاوہ مسلمانوں میں عام بیداری کا سبب بن جائے گا اور ان کو اندازہ ہوجائے گا کہ وہ کسی مسئلہ پر متفق ہوکر اپنی زندگی کا ثبوت دے کر کتنے بڑے بڑے کام انجام دے سکتے ہیں اور کتنے بڑے خطرات سے اپنے کو بچا سکتے ہیں۔

سوال:۔ مسئلہ کے اس روشن پہلو اور افادیت کے ساتھ جو ہر مسلمان بلکہ ہر مُحب وطن کے لیے تسلی بخش ہے، آپ کو اس سلسلہ میں سب سے بڑا خطرہ کیا محسوس ہوتا ہے، آپ نے نہ صرف ہندوستان کی بلکہ امت اسلامیہ کی علمی، فکری، اصلاحی اور تجدیدی تاریخ لکھی ہے، اور آپ نے عالم اسلام کا رباط ومراکش سے لے کر سری لنکا وبنگلہ دیش تک کا سفر کیا ہے، اور ان ملکوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ اور خطرات سے ہوشیار کیا ہے، ہم آپ سے یہ سننا چاہتے ہیں کہ اس سفر میں (جو ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے) سب سے زیادہ دشوار گزار گھاٹی کون سی ہے، جس سے آپ سب سے زیادہ خطرہ محسوس کرتے ہوں۔

جواب:۔ آپ نے یہ سوال کر کے میرے دل ودماغ کے داغ کہن تازہ کردیئے اور ''ناگفتنی'' کو ''گفتنی'' بنادیا، مجھے یہ ناخوشگوار فرض انجام دینا ہی پڑے گا، بقول اقبال ؎

چمن میں تلخ نوائی میری گوارہ کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی

مجھے سب سے بڑا خطرہ (جواب خطرہ نہیں رہا، بلکہ مشاہدہ بنتا جارہا ہے) مسلمانوں کی ان دو کمزوریوں یا بیماریوں سے ہے، جو دل پر پتھر رکھ کر کہتا ہوں کہ ہندوستان کی حد تک ملّی مزاج بنتا جارہا ہے، ایک عجلت و بے صبری، وہ یہ کہ مسئلہ کتنا ہی طویل المیعاد، صبر آزما اور پیچیدہ ہو، یہاں کے مسلمان ہتھیلی پر سرسوں اگانے کے قائل ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ جو مہم صبح شروع ہوئی ہے، وہ سورج غروب ہونے سے پہلے کامیاب ہونی چاہئے اور بیل منڈھے چڑھ جانی چاہئے، مسائل کو کامیابی سے حل کرنے میں ایک بڑا فیکٹر (Factor) صبر و تحمل، قوت برداشت اور بلند حوصلگی ہے، مسلمانوں ہی کی تاریخ نہیں، تمام زندہ وفاتح قوموں کی تاریخ (خود سیرت نبوی جس سے بڑھ کر ہمارے لیے کوئی اسوہ ونمونہ نہیں) تلخ وشیریں، سرد وگرم، نشیب وفراز کے مناظر کا مجموعہ اور ایک طویل، صبر آزما، زہرہ گداز جدوجہد کی روداد ہے، تحریکات اور مہمات کی تاریخ بھی ہمیں یہ سبق دیتی ہے، لیکن ہندوستانی مسلمانوں کا مزاج اس کے برخلاف معرکہ کو چٹکیوں میں فتح کر لینے کا قائل ہے۔

ابھی ستمبر کے دوسرے ہفتہ میں میں بمبئی میں تھا، وہاں مہاراشٹر مسلم پرسنل لا بورڈ کی ایکشن کمیٹی کا جلسہ تھا، مجھے بھی اس میں شرکت کا موقع ملا، سنجیدہ اور تعمیری انداز میں گفتگو کا سلسلہ جاری تھا، اور ہفتۂ تحفظ شریعت منانے کے لیے ضروری اقدامات پر غور کیا جارہا تھا کہ اچانک ایک نوجوان کھڑے ہوئے اور انھوں نے ایک مضمون پڑھنا شروع کیا کہ زندہ قوموں اور ملکوں کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی جماعت کسی مسئلہ کے حل کرنے میں ناکام ہوجاتی ہے تو پیچھے ہٹ جاتی ہے اور دوسروں کے لیے جگہ خالی کر دیتی ہے، اتنی طویل مدت ہوگئی اور مسلم پرسنل لا بورڈ مسئلہ کو حل نہیں کرسکا، اس لیے اس کو اب اپنی ناکامی کا اقرار کر لینا چاہئے، اور دوسروں کو کام کا موقع دینا چاہئے، یہ سن کر اپنی افتاد مزاج کے برخلاف میرے اندر سخت تأثر پیدا ہوا، اور میں نے کہا کہ یہ ایک مریضانہ ذہنیت کی علامت ہے، آپ نے برادران وطن کے کردار کا بھی مطالعہ کیا ہے؟ انھوں نے تحریک آزادی کے سلسلہ میں، نیز اپنے تعمیری منصوبوں کی تکمیل میں کتنے صبر و تحمل سے کام لیا،

اور اپنے رہنماؤں کو کام کرنے کا کتنا طویل موقع دیا، گاندھی جی ہوں یا مالوی جی یا دوسرے ہندو سیاسی لیڈر اور قومی معمار، انھوں نے کتنے سکون و اطمینان قلب کے ساتھ کام کیا، دو ہی دن بعد قوم نے ان کا دامن جھٹکنا اور گریبان پکڑنا نہیں شروع کیا، مسلمانوں کو تو صبر و تحمل کا زیادہ عادی ہونا چاہئے کہ ان کا صحیفہ اور ان کے نبی کا اسوہ اور خدا کی قدرت کاملہ پر یقین ان کو زیادہ وسیع القلب اور وسیع النظر بنا دیتا ہے، مگر افسوس ہے کہ معاملہ الٹا ہے۔

مسلمانوں کی دوسری کمزوری جواب ایک نیشنل کیرکٹر کا رنگ اختیار کر گئی ہے، وہ ان کی اپنے قائدین کے بارے میں بے اعتمادی، بدگمانی، شدید احتساب، بے ضرورت تنقید اور کردار کشی ہے، پھر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ برادرانِ وطن کا اپنے سیاسی، تعلیمی، تعمیری رہنماؤں اور سماجی کام کرنے والوں کے بارے میں رویہ بالکل مختلف ہے، اپنے رہنماؤں سے بلند اخلاقی معیار، ہر شک وشبہ سے بالاتر دیانت کی توقع، اسلامی تعلیمات اور اسلامی تصورات کے عین مطابق ہے، لیکن اس میں اس حد تک افراط وغلو کہ ہر کام بدگمانی سے شروع کیا جائے اور ہر قائد وخادم ملت کو بے اعتمادی اور بے توقیری کی نظر سے دیکھا جائے اور اس پر بڑے سے بڑا الزام لگانے میں پس وپیش نہ کیا جائے، اس کے بارے میں بعید از قیاس سے بعید از قیاس بات کو فوراً باور کر لیا جائے، افواہ پھیلانے اور ان کو مان لینے میں ذرا بھی احتیاط وتامل سے کام نہ لیا جائے، ایک ایسی مہلک بیماری ہے جو پورے شیرازۂ ملت کو درہم برہم کرنے کے لیے کافی ہے، اور بڑے سے بڑے شیر دل، کوہ وقار اور پاک باز وپارسا خادم دین اور بڑے بڑے طوفانوں میں کشتیِ ملت کے سرپھرے ملاح کا دل توڑ دینے اور اس کی ہمت پست کر دینے کے لیے کافی ہے، وہ دشمنوں کی اذیتوں، قید وبند کی سزاؤں، بچوں اور افرادِ خاندان کے فاقے کو برداشت کر سکتا ہے، اور اس کی پیشانی پر شکن نہیں آسکتی ہے، لیکن اتہام اور الزام، کردار کشی اور ملت کا غدار بنائے جانے سے اس کا دل چور چور ہو جاتا ہے اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں، کسی نے سچ کہا ہے کہ ایک بڑھیا کو حضرت عمرؓ کے ٹوکنے، ایک اعرابی کو سوال پوچھ لینے کی روایات

کو ہمارے قومی جلسوں اور مجالس وعظ میں ایسے مبالغہ اور بے اعتدالی سے بیان کیا گیا ہے کہ ہر شخص نے اس کی تقلید شروع کردی ہے، چاہے امیر المومنین فاروق اعظم کے مقام کا آدمی نہ ہو لیکن پوری قوم بڑھیا اور اعرابی کا کردار ادا کرنا چاہتی ہے، اکثریتی فرقے کا اپنے رہنماؤں اور کارکنوں کے بارے میں رویہ واضح طور پر اس کے برعکس ہے، اپنی دوسری کمزوریوں کے باوجود وہ نمایاں طور پر اس سلسلہ میں محتاط، فراخ دل اور وسیع النظر واقع ہوئے ہیں۔

سوال:۔ مسلمانوں میں سے بعض ''معروف'' اشخاص نے ''تجاہل عارفانہ'' سے کام لیا ہے، اور سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کے اس جزء کی حمایت کی ہے کہ مطلقہ کو سابق شوہر کی طرف سے جب تک وہ دوسری شادی نہ کرلے، حین حیات گزارا دیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے، اور اس کا اگر حق شریعت میں نہیں ہے، تب بھی اس کو مان لیا جائے تو اس میں کیا مضائقہ ہے، کہ قانون شریعت کوئی چھوئی موئی نہیں ہے کہ ایسی چیزوں سے ٹوٹ جائے، اور اگر اس میں تھوڑی سی ترمیم بھی ہوجاتی ہے تو بھی کوئی بڑی مصیبت نہیں آتی، یہ ائمہ کے اجتہادات ہیں جو وہ ہر زمانہ میں کرتے آئے ہیں، اور ائمہ کو بت نہیں بنانا چاہئے، نیز انھوں نے قرآن مجید میں ''متاع'' کے لفظ کی تشریح میں اور مطلقہٴ بائنہ کو عدت کے بعد بھی گزارا دینے کو قرآنی سیاق وسباق سے الگ کرکے پیش کیا ہے، ان کے بارے میں ہمارے علمائے دین اور خاص طور پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مقتدر اراکین جو ہندوستان کے عظیم ترین مذہبی اور تعلیمی اداروں کے سربراہ وذمہ دار ہیں، فتویٰ کی زبان کیوں نہیں استعمال کرتے اور ان پر فقہی حکم لگا کر مسلم معاشرہ سے خارج کیوں نہیں کرتے تاکہ دوسرے اس سے عبرت حاصل کریں اور ایسی جرأت سے کام نہ لیں۔

جواب:۔ آپ نے ایک معقول بات پوچھی ہے، بورڈ کے دوسرے اہل علم ارکان اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہیں، لیکن میرا ذاتی رجحان اور مشورہ یہ ہے کہ ہمارے علماء اور ہمارے مذہبی اداروں کو اس عہد اور ملک میں مسیحی یورپ کے قرون وسطیٰ (جن کو قرون مظلمہ (Dark Ages) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کی طرح اعتقادات کی

تحقیق کی عدالتوں (Courts of Enquisation) جن کو عربی کتابوں میں ''محاکم التفتیش'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کا کردار ادا کرنا مناسب نہیں جو اپنے نزدیک بداعتقاد عیسائیوں کو دائرۂ اعتقاد سے خارج کیا کرتی تھیں، اور ان کو لرزہ خیز سزائیں دیتی تھیں، جس کی وجہ سے یورپ میں ایک طبقہ کلیسا سے بیزار اور عیسائیت سے متنفر ہو گیا، میرے خیال میں اس کے مقابلہ میں ہمیں مسلم معاشرہ میں وہ دینی شعور پیدا کرنا چاہئے جو خود ان تجدد پسندوں یا بر خود غلط فقیہوں اور مفسروں کا محاسبہ کرے اور ان کو محسوس کرائے کہ انھوں نے اپنے کو مسلم معاشرہ سے خود کاٹ لیا ہے، اور فتنہ کا ایک بہت بڑا دروازہ کھول دیا ہے، معاشرہ کا یہ طرز عمل ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے اور (اگر ان میں ذرا بھی ملی غیرت ہے تو) اپنی روش اور طرز عمل کی غلطی محسوس کرا دینے کے لیے کافی ہے، وہ یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ اس معاشرہ میں ایک فرد معاشرہ کی طرح رہنا اچھا ہوگا، جس کے ساتھ مرنا اور جینا ہے، اور جو دکھ سکھ میں کام آتا ہے، یا اس عارضی عزت تعریف و تعارف کا خیال کرنا جو ڈھلتی چھاؤں اور بے وفا ساتھی ہے۔

سوال :۔ایک آخری سوال کی اور اجازت چاہتا ہوں جو اپنی اہمیت وافادیت میں پچھلے سوال سے کم نہیں، اور میرے خیال میں بہت سے حساس اور حقیقت پسند مسلمانوں اور دانشور طبقہ کے ذہن میں یہ سوال گشت کرتا ہے۔

جواب:۔وہ سوال بھی ضرور کر لیجئے تا کہ مسئلہ کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔

سوال :۔آپ کے نزدیک اس مسئلہ اور اس اہم دینی وملّی مہم کے سلسلہ میں اب کرنے کے کیا کام ہیں، اور آئندہ کا نظام عمل کیا ہوگا؟

جواب :۔آپ نے بہت ضروری اور برمحل سوال کیا، اس انٹرویو میں بہت کمی رہ جاتی اگر یہ گوشہ سامنے نہ آتا، میرے نزدیک اوّلین اور اہم کام خود مسلمانوں میں شرعی، عائلی قانون پر عمل کرنے کی دعوت و تبلیغ ہے، جس کے اہم اور مرکزی اجزاء حقوق الزوجین، اسلامی تعلیمات اور اسوۂ نبوی کے مطابق ازدواجی زندگی گزارنا، شفقت ومحبت اور قرآنی

الفاظ میں "وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَوَدَّةً وَّرَحْمَةً" کے اصول پر ایسی ازدواجی وعائلی زندگی گزارنا جس میں محبت ومودّت اور رحمت کا عنصر غالب ہو، صلہ رحمی، ترکہ کی شرعی تقسیم، طلاق کے حق کا نہ صرف شرعی بلکہ مسنون طریقہ پر استعمال ہو، اور "وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ" (اور اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جس کے واسطہ سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابتوں کے باب میں بھی تقویٰ اختیار کرو) کی اس ہدایت قرآنی پر عمل جو تمام انسانی، اسلامی واخلاقی پہلوؤں اور گوشوں پر حاوی ہے، اس کے لیے ایک طوفانی مہم چلانے کی ضرورت ہے جس کے اثر سے شہر تو شہر کوئی قصبہ اور گاؤں اور مسلمانوں کا کوئی محلّہ اور خاندان بھی بے خبر اور بے اثر نہ رہے، اس کے لیے مساجد کے منبر ومحراب، مجالس وعظ، اسلامی اجتماعات وتقریبات، اخبارات ورسائل اور ابلاغ عامہ کے تمام ذرائع پوری سرگرمی سے استعمال ہونے چاہئیں، میرے نزدیک یہ بنیادی کام ہے اور ان میں ان مشکلات اور خرابیوں کا اصل علاج ہے، جنھوں نے اس وقت نازک مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے، اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے "اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا وَّیُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ" (الانفال) (اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمھیں ایک فیصلہ کی چیز دیدے گا، اور تم سے تمہارے گناہ دور کر دے گا) میں نے کلکتہ کے آخری اجلاس میں جس میں حاضرین کی تعداد کا اندازہ ۵ لاکھ کیا گیا ہے، صفائی سے اس معاملہ میں مسلمانوں کا احتساب کیا تھا، اور ان سے کہا تھا کہ وہ خود اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھیں اور اپنے گھروں کا جائزہ لیں کہ وہ اس شرعی قانون وتعلیم (جو دین کا ایک مستقل اور اہم شعبہ ہے) پر کس قدر عمل کرتے ہیں؟ ضرورت ہے کہ اس خطبہ ومقالہ کی اردو، ہندی اور علاقائی زبانوں میں زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔

۲۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ اور ملک کے دانشور اور حقیقت پسند غیر مسلموں کو اسلام کے عائلی نظام کی برتری، اس کے منصفانہ، عقل سلیم اور فطرت انسانی کے مطابق ہونے کو (جو خدائے حکیم ودانا، رؤوف ورحیم اور خالق کائنات

اور مربی نوع انسانی کا بنایا ہوا ہے) علمی انداز ناقابل تردید دلائل اور مذاہب اور عائلی قوانین اور نظاموں کے تقابلی مطالعہ کے ساتھ انگریزی، اردو، ہندی اور علاقائی زبانوں میں پیش کیا جائے، یوں تو ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' ندوۃ العلماء (لکھنؤ) مرکزی مسلم پرسنل لا آفس (مونگیر) مکتبۂ جماعت اسلامی ہند (دہلی) اور بعض دوسرے تصنیفی وتحقیقی اداروں کی طرف سے متعدد وقیع چیزیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن اس میں وسعت وترقی اور اضافہ کی ضرورت ہے، اس موضوع پر صاحب نظر، صاحب ایمان ماہرین قانون اور اہل قلم سے کتابیں لکھوائی جائیں، سیمنار، سمپوزیم منعقد کئے جائیں، جن میں ممالک عربیہ کے چوٹی کے فضلاء، ماہرین فقہ اسلامی کو دعوت دی جاسکتی ہے اور میں بھی رابطۂ عالم اسلامی کی بین الاقوامی المجمع الفقہی (مسائل وتحقیقات کی اکیڈمی) کا بنیادی رکن ہونے کی بناء پر اس کی ذمہ داری لے سکتا ہوں کہ وہ اس دعوت کو لبیک کہیں گے، اور شوق سے شرکت کریں گے، اس سلسلہ میں اس موضوع پر نیز دوسرے ملّی مسائل پر ڈائیلاگ (Dialogue) کا انتظام کرنا بھی مفید ہوگا، اور بعض اہل علم اس پر سنجیدگی سے غور بھی کر رہے ہیں۔

۳۔ تیسری اور ایک بنیادی ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر چہ بائنہ کو عدّت کے بعد سابق شوہر سے قانونی طور پر مستقل گزارا دینا جس کو (Mentenance) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، شرعاً، عقلاً کسی طرح درست نہیں، شرعاً تو اس لیے نہیں کہ قرآنی نصوص واحکام اور امت کے تعامل کے مطابق اس کی گنجائش نہیں، انتظاماً اس لیے کہ پھر اس کے بعد مسلم معاشرہ میں بھی سفاکی اور بے دردی کے وہ واقعات رونما ہوں گے جو ملک کے ایک وسیع معاشرہ میں پیش آرہے ہیں اور نئی بیاہی ہوئی عورتیں مطلوبہ جہیز نہ لانے پر جلائی جارہی ہیں اور ان سے کسی طرح پیچھا چھڑایا جارہا ہے، میں نے وزیر اعظم صاحب سے اپنی ایک نجی گفتگو میں صفائی سے کہا تھا کہ راجیو جی! اگر یہ قانون بن گیا تو یہ لکھ رکھئے کہ بجائے طلاق کے ذریعہ پیچھے چھڑانے کے ایسی ناپسندیدہ رفیقۂ حیات کو زہر دے کر یا جلا کر ختم کیا جائے گا، جیسا کہ آج ہمارے ملک میں بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔

نفقۂ مطلقہ کی اس مستقل قانونی شکل (گزارے کو چھوڑ کر) شریعت کے بتائے ہوئے ان متبادل انتظامات کو زندہ اور قائم کرنا پڑے گا جن کی شریعت نے ترغیب دی ہے، اور جو شریعت اسلامی کے برکات میں سے ہیں، مثلاً عورت کو والدین اور دوسرے مورثین کے ترکہ سے شرعی حصہ دلانا، جو بعض شکلوں میں واجب ہے اور بہت سے خاندانوں اور معاشروں میں عرصہ سے متروک ہے، مطلقہ کے قریبی رشتہ داروں (ذوی الارحام) اولاد، بھائیوں اور اگر والدین زندہ ہوں تو ان کو اس کے ساتھ اعانت ومواسات (ہمدردی وغمخواری) اور صلہ رحمی کی ترغیب دینا، اس کی کفالت کا مناسب بندوبست کروانا، اگر نکاح ثانی کی عمر اور حالات ہیں تو اس کی ترغیب وتحریض، نیز اسلامی بیت المال کا قیام جس سے نادار اور ضرورت مند افراد کو ضروریات زندگی اور قوت مالا یموت فراہم کیا جائے۔

اس سے بڑھ کر پورے مسلم معاشرہ میں ہمدردی، سلوک، ایثار وفیاضی کا جذبہ پیدا کرنا، جو ہزار بیماریوں کا علاج ہے، اور ہزار مشکلات ومسائل کا حل، اور جو مسلم معاشرہ کو وضعی قوانین سے مستغنی کرتا ہے، اور صدر اوّل اور اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اس کی تابناک مثالیں ہیں، اور اس کا زندہ ثبوت ملتا ہے، یہ ہیں کرنے کے وہ کام جن کو جلد سے جلد شروع ہو جانا چاہیئے، اور جو اسلام کی روح، مزاج اور شریعت الٰہی اور تعلیمات آسمانی سے پوری مطابقت رکھتے ہیں، اور انھیں میں شریعت کا اصل تحفظ اور اس ملک وعہد میں مسلمانوں کے ایک صاحب شریعت، صاحب کردار، اور صاحب مقام مستحکم وباعزّت، خوددار اور غیور ملت کی حیثیت سے باقی رکھنے کی ضمانت ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کی صحیح نوعیت واہمیت

مسلمانوں کے لیے مسئلہ کی تشریح و تفہیم، مسئلہ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ
اور ملک کے دانشور اور انصاف پسند طبقے کو دعوتِ فکر

(خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)
کانفرنس کلکتہ، منعقدہ ۶، ۷/اپریل ۱۹۸۵ء)

پیش نظر مقالہ وہ خطبہ ہے جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا کانفرنس منعقدہ کلکتہ ۶، ۷، ۸/اپریل ۱۹۸۵ء میں بحیثیت صدر بورڈ کے ۶/اپریل کو بورڈ کے اجلاس میں زبانی ارشاد فرمایا تھا، اس اجلاس میں مسلمانانِ ہند کی تمام دینی وسیاسی جماعتوں، مسلم تنظیموں، اور مختلف مکاتب خیال کے ذمہ داروں، مسلم دانشوروں، اور سربرآوردہ علماء اور قانون دانوں کی ایک بڑی تعداد شریک تھی، تقریر ریکارڈ ہوگئی تھی، کیسٹ سے نقل کرانے اور مولانا کی نظرثانی کے بعد اس خیال سے شائع کیا جارہا ہے کہ اس میں مسئلہ کے اصولی وبنیادی پہلو آگئے ہیں اور مسلم پرسنل لا کے متعلق غلط فہمیوں کا پس منظر اور ان کی نفسیات، الٰہی وآسمانی قانون اور دنیوی وانسانی قانون کے درمیان نازک فرق اور یکساں سول کوڈ کے ملکی اتحاد کی راہ میں غیر مؤثر وغیر منطقی ہونے کی وضاحت ایسے دل نشیں انداز میں ہوگئی ہے جس سے نہ صرف حقیقت پسند غیر مسلم حضرات بلکہ خود مسلمانوں کو بھی اس مسئلے کے بارے میں صحیح روشنی اور رہنمائی حاصل ہو سکے گی۔

افسوس ہے کہ کیسٹ کے تاخیر سے حاصل ہونے اور مولانا کے مسلسل سفروں کی وجہ سے رسالے کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوگئی ہے، پھر بھی وہ ایک فکر انگیز، بصیرت افروز، اور ایک تاریخی دستاویز ہونے کی بنا پر مستقل افادیت اور قدر و قیمت کا حامل ہے، اس لیے امید ہے کہ اسے پوری توجہ اور اہمیت کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

شمس تبریز خاں
رفیق مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ

۲۶/رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ
۱۶/جون ۱۹۸۵ء

خطبۂ مسنونہ کے بعد!

حضرات! سب سے پہلے میں اس بات پر معذرت کرتا ہوں کہ میں اس اہم موقع پر کوئی لکھا ہوا خطبہ پیش نہیں کررہا ہوں، میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اندرونی اور بیرونی سفروں میں مشغول رہا، اور مسلسل انہماک اور مصروفیت رہی، لیکن اس غیرارادی اور اضطراری کوتاہی میں خیر کا بھی ایک پہلو ہے، تیار کئے ہوئے بلند پایہ خطبہ ہائے صدارت کی افادیت اور اہمیت کو کم کئے بغیر جواب ہماری علمی، ادبی وسیاسی تاریخ کا جز بن گئے ہیں، میں یہ کہنے کی جرءت کروں گا کہ بعض مرتبہ خطبۂ صدارت کُل کا کُل یا اس کا کوئی جز بے محل یا بعد از وقت ثابت ہوتا ہے، اور حالات میں تغیّر کی وجہ سے اپنی تازگی اور برجستگی کھو چکا ہوتا ہے، اس لیے شاید اس میں بھی حکمت الٰہی کو دخل ہو کہ اس فضاء میں تازہ حالات کے مطالعہ کے بعد آپ سے براہ راست خطاب کررہا ہوں۔

حضرات! کسی بھی مسئلہ سے اختلاف یا کسی حقیقت سے گریز اور مخالفت کا باعث صرف مخالفت کا جذبہ، عناد یا سیاسی مصالح اور مفادات ہی نہیں ہوتے، اکثر غلط فہمی یا ناواقفیت یا ناقص واقفیت (جسے میں ناواقفیت سے زیادہ خطرناک سمجھتا ہوں) اس کی ذمہ دار ہوتی ہے، افراد اور خاندانوں کی سطح پر بھی، ملتوں اور قوموں کی سطح پر بھی اور ملکوں اور سلطنتوں کی سطح پر بھی ایسی غلط فہمیاں، ناواقفیت اور ناقص واقفیت بڑے اہم اور سنگین نتائج کا سبب بنی ہے، اور قوموں، تہذیب وتمدن، سلطنتوں اور مذاہب کی تاریخ اس کی شہادتیں پیش کرتی ہے کہ بعض مرتبہ کسی غلط فہمی، ناواقفیت یا ناقص واقفیت کی بناء پر بے ضرورت جنگیں برپا ہوگئی ہیں، سلطنتیں سلطنتوں سے ٹکرائی ہیں، اور بعض اوقات وحشتیں وحشتوں سے نہیں وحدتیں وحدتوں سے ٹکرائی ہیں۔

مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں بھی نہ ہم کو اس کی ضرورت ہے نہ اس کا شوق ہے کہ ہم

ان سب لوگوں کے بارے میں جوملت اسلامیہ کے دائرے سے باہر ہیں، یا ان گروہوں، عناصر یا مکاتب خیال پر جو مسلم پرسنل لا کے مخالف ہیں اور جو ہندوستان پر یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کے داعی اور اس کے حامی ہیں، یہ الزام لگائیں کہ ان میں مخالفت ہی کا جذبہ یا عناد کام کررہا ہے، میرا خیال ہے کہ اس میں غلط فہمی اور زیادہ تر ناقص واقفیت کو دخل ہے۔

مسلمانوں کے عائلی قانون کی اہمیت اور صحیح حیثیت کیا ہے؟ اس کے متعلق میں دو حقیقتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، اور ان سب حضرات کو جو مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے عادی ہیں، اور ان میں حب الوطنی کا جذبہ ہے اور ان کا ذہن تخریبی Destructive نہیں بلکہ تعمیری Constructive اور حقیقت پسند Realistic واقع ہوا ہے، اور وہ صداقت کو قبول کرنے کے لیے ہروقت تیار رہتے ہیں، دو بنیادی حقیقتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، اور اس مؤقر مجلس کے توسط سے صحافت اور ابلاغ عامہ Public Media کے سنجیدہ اور ذمہ دار ذرائع سے میں اپنی آواز دور دور تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

۱۔ مذاہب کے تقابلی مطالعہ (Comparative Studies) کی روشنی میں جس کا میں ایک طالب علم ہوں ان تمام آسمانی مذاہب کے بارہ میں کہہ سکتا ہوں جو صحیفے رکھتے ہیں، اور جن کے یہاں نبوت کی تاریخ ہے لیکن میرے لیے زیادہ محتاط صورت یہ ہے کہ میں اس دین کی طرف سے عرض کروں جس سے میرا اور آپ کا انتساب ہے کہ اس کی ایک بنیادی حقیقت یہ ہے کہ یہ دین جو ہم تک پہنچا ہے اور جس دولت کے ہم آپ امین اور (محافظ کا لفظ تو بڑا ہے) اس دولت کے حامل ہیں، وہ دین ہمیں دانشوروں کے ذریعہ، سماجی خدمت گاروں، اصلاحی کام کرنے والوں (Reformers) یا بانیان سلطنت کے ذریعہ نہیں پہنچا، یہ سارے گروہ قابل احترام ہیں، لیکن کسی دین میں اور کسی تہذیب، نظام فکر، دبستان (School of Thought) اور خالص مطالعہ، غور وفکر، اور تجربہ کے نتائج میں ایک حد فاصل سرحدی لکیر (Line of Demarcation)

ہے، جوایک کودوسرے سے جدا کرتی ہے، اس خط کوکسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، یہ حد فاصل یہ ہے کہ آسمانی مذاہب (ادیان) ان برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہنچے ہیں، جن کواللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا، اور جن پر وحی آتی تھی، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے خلط مبحث (Confusion) ہوتا ہے، زیادہ تر لوگ نادانستہ طریقہ پر ان مذاہب سے توقع اور بعض اوقات آگے بڑھ کر ایسی چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں جن کی ان مذاہب میں گنجائش اوران کا کوئی جواز نہیں، وہ بعض اوقات ان کی تشریح کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے ہیں، اپنی وسعت مطالعہ اور وسعت نظر کے اظہار کے لیے وہ مذاہب کی ترجمانی ایسی کرنے لگتے ہیں، جیسے کہ یہ نرے فلسفے یا انسانوں کے بنائے ہوئے تہذیب وتمدن کے نظام اور سماجی تجربے اور معاشرتی نظریات ہیں، یہ ہے وہ غلطی جو نادانستہ طریقے پر بعض بڑے ذمہ دار اور سنجیدہ لوگوں سے ہوتی ہے، وہ یہ نہیں جانتے کہ دین اور غیر دین میں حدِ فاصل اور امتیازی نشان کیا ہے؟ فلسفہ، سماجیات کا علم (Social Sciences) تہذیب وتمدن (Civilization) سوسائٹی اور انسانی معاشرہ، یہ سب اپنی جگہ حقائق ہیں، ہم ان کا انکار نہیں کرتے ان کا احترام کرتے ہیں، اور اپنے ذمہ ان کے حقوق سمجھتے ہیں، خود مسلم ملت ایک معاشرہ، تہذیب وتمدن اور فکر ودانش کا ایک مستقل مدرسہ (School of Thought) بھی ہے، لیکن اس کی جو اصل حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک دین ہے، اور اس دین کو دنیا میں پیش کرنے والے اور اس کو بروئے کار لانے والے، اس کو ہماری زندگی میں داخل کرنے والے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں، اور یہ ان کی زبان اور ان کا طرز فکر نہیں، اس کا بنیادی چشمہ ان کے دماغ میں نہیں تھا، بلکہ ان سے باہر اور ان سے بلند تھا، اور وہ ان کے لیے اسی درجہ قابل احترام اور قابل اطاعت تھا، جیسے ہمارے آپ کے لیے اور سارے امتیوں کے لیے "وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی، اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی"۔ (۱) (وہ خواہش نفس سے منھ سے بات نہیں نکالتے ہیں یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے (جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے) "مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَاالْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ

(۱) سورۃ النجم: ۳، ۴

جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ط وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ".
(۱) (آپ نہیں جانتے نہیں جانتے تھے لکھنا پڑھنا کیا ہوتا ہے، ہم نے اس کو ایک نور کی طرح آپ کے سینہ میں اتارا، اور اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور بے شک (اے محمدؐ) تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو)۔

اچھے اچھے سنجیدہ اہل علم اور اہل فکر اس مغالطہ میں ہیں، اس پر انھوں نے اپنی عمریں گزار دیں۔ ایک کتب خانہ تیار ہو گیا، اور اس نے غیر ضروری طور پر ایک مہم اور ایک معرکہ آرائی (Conflict) کی شکل اختیار کر لی ہے، حالانکہ اس کی کوئی بنیاد نہیں، سیدھی سی بات یہ ہے کہ آپ جس دین کے ماننے والوں کو مخاطب کرتے ہیں، اُن سے توقع اور مطالبہ کرتے ہیں، ان کو مشورہ دیتے ہیں، پہلے آپ ان کا مزاج اور ان کا امتیاز سمجھ لیں، وہ پیغمبروں کی ایک ایسی جماعت اور اس جماعت اور اس جماعت کے خاتم اور اس جماعت کے فردِ اکمل کے تابع ہیں جس کا رشتہ وحی الٰہی سے تھا، اور وہ خود وحی کا انتظار کرتا تھا، بیسیوں حدیثیں ہیں، جو میں اس وقت آپ کے سامنے پیش نہیں کر سکتا کہ لوگ پوچھنے آئے آپ نے کہا انتظار کرو، اور آپ خود انتظار کرتے رہے، اور بعض مرتبہ تو ایسا ہوا کہ سائل موجود ہے، اور آپ پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی اور کسی صحابی نے اپنے دوست سے کہا کہ دیکھو، تم دیکھنا چاہتے تھے کہ وحی کس طرح آتی ہے تو دیکھ لو، بعض دفعہ ایسا ہوا کہ ساق مبارک کسی کی ساق پر تھی، اور وحی کا نزول شروع ہوا، وہ کہتے ہیں کہ قریب تھا کہ میری ٹانگ ٹوٹ جائے، اتنا بوجھ تھا، اس لیے کہ وحی کے ساتھ ایک بوجھ ہوتا تھا، اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس مادّی دنیا سے آپ کا رشتہ منقطع ہو چکا ہے، اور آپ کسی اور عالم میں ہیں، اور اس کے بعد آپ نے وحی کے الفاظ سنانے شروع کئے، ایک مرتبہ کفار نے اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق سوال کیا، آپ نے وحی کا انتظار کیا، یہاں تک کہ کئی روز (پندرہ دن) گزر گئے اور کفار کو اعتراض کا موقعہ مل گیا، جب سورۂ کہف نازل ہوئی تب اس کا جواب آیا، اور اللہ تعالیٰ نے وہ قصہ سنایا (۲)، آپ نے اس طرح سنایا جیسے کوئی کتاب پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

---

(۱) سورۃ الشوریٰ: ۵۲ (۲) ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر، ج ۴/ص: ۳۶۶

وحی ونبوت کا فرق اساسی فرق ہے ہمیں غیر مسلم بھائیوں اور غیر مسلم فضلا سے زیادہ شکوہ نہیں کہ وہ وحی ونبوت کے عہد سے اتنے دور ہو چکے ہیں، کہ ان کے مفہوم سے بھی بہت سے حضرات ناآشنا ہیں، بعثت محمدی سے پہلے خود عربوں کا یہی حال تھا، اس میں نہ کسی کی ذہانت کا انکار ہے اور نہ کسی کی نیت پر حملہ ہے، ایک تاریخی یا نفسیاتی تجزیہ ہے کہ جو شخص نبوت اور وحی کی حقیقت سے واقف نہیں اور یہ نہیں جانتا کہ اس کا کیا مرتبہ اور حق ہے اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ کس چیز کی متقاضی ہے، وہ مسلمانوں کے بارے میں مشورہ دینے یا فیصلہ کرنے کا اخلاقی یا قانونی طور پر مجاز نہیں، عدالت میں پہلی بات یہ طے کی جاتی ہے کہ تمہیں بحث کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ یہاں بڑے بڑے تجربہ کار قانون داں موجود ہیں، ان کو پہلے اپنی سند وکالت پیش کرنی ہوتی ہے اگر معلوم ہے فاضل جج کو کہ یہ باقاعدہ قانون کے فاضل ہیں اور سند رکھتے ہیں وکالت کی، اور مقدموں میں آتے رہتے ہیں تو ضرورت نہیں، لیکن پہلی مرتبہ کوئی وکیل یا بیرسٹر جائے گا تو یہ اطمینان کیا جائے گا کہ یہ قانون کا طالب علم رہا ہے، اور قانون کی سند اس کے پاس ہے یا نہیں، پھر یہ دیکھا جائے گا کہ موکّل نے بھی اس کو اپنا ترجمان بنایا ہے یا نہیں، لیکن دین کا معاملہ عجیب وغریب ہے کہ اس کی حقیقت معلوم کئے بغیر اس کی تاریخ معلوم کئے بغیر، اس کی روح معلوم کئے بغیر ہر شخص اپنا حق سمجھتا ہے کہ اس کے بارے میں مشورہ دے، اور یہاں تک کہ ترمیم اور اصلاح کا مطالبہ کرے، اور اگر اس کو قبول نہیں کیا جاتا تو اس دین کے ماننے والوں پر جمود و جہالت کا الزام لگایا جاتا ہے اور ان کو کم عقل ثابت کیا جاتا ہے۔

میں اصلاً مذہب کا طالب علم ہوں، زیادہ سے زیادہ تاریخ وادب کا طالب علم ہوں، میں کسی وقت یہ جرأت نہیں کرسکتا کہ کسی ایسے فن یا مسئلہ میں دخل دوں جس کے مبادی (Fundamentals) سے بھی میں ناواقف ہوں، اگر کوئی شخص سائنس کے مبادی، فزکس کے مبادی یہاں تک کہ ریاضی (Mathematics) کے مبادی سے (جو روزمرہ کی ضرورت ہے) ناواقف ہے تو دنیا کا کوئی پڑھا لکھا انسان اس کو اجازت نہیں

دے سکتا کہ وہ یہ کہے کہ فلاں ماہر ریاضی نے یہ نتیجہ جو نکالا ہے غلط ہے! لیکن کیا مذہب ہی ایک ایسی چیز رہ گئی ہے کہ اس کے متعلق جس کا جی چاہے، جس وقت جی چاہے اور جس انداز میں جی چاہے مشورہ دیا جائے، اس کی ترجمانی کی جائے، اور اس میں خامیاں نکالی جائیں اور اس میں ترمیمات پیش کی جائیں، اس سے پورے نظام علم پر اثر پڑے گا، عصر حاضر کا سارا نظام اعتماد و اختصاص (Specialisation) پر چل رہا ہے کیا مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے، جس کے ماہرین خصوصی کی کوئی قیمت نہیں؟ پھر مذہب کی ایک زبان ہوتی ہے، مذہب کے اصطلاحات ہوتے ہیں، اس کے الفاظ کے اعماق (گہرائیاں) وآفاق (وسعتیں) ہوتے ہیں، اس کی نفسیات ہوتی ہیں، یہ ساری چیزیں جانے بغیر کوئی شخص بھی (خواہ وہ مسلمان ہو غیر مسلم ہو اور کسی گروہ کا آدمی ہو) اگر کہتا ہے کہ صاحب، مسلمانوں کے عائلی قانون کا فلاں مسئلہ غلط ہے تو وہ اپنے حدود سے تجاوز کرتا ہے، وہ پورے سیاق وسباق سے ناواقف ہے اس توازن وتناسب سے ناواقف ہے جس کا لحاظ رکھا گیا ہے، آپ یہ نہیں دیکھتے کہ اگر ایک مکمل ڈھانچہ اور جامع ماحول کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے تو اس کو مجموعی طور پر دیکھنا ہوتا ہے، حالت یہ ہے کہ چوراہے پر کھڑے ہو کر (اور یہ اخبارات بھی ایک طرح کے گھومتے پھرتے چوراہے ہیں) جس کا جی چاہتا ہے قلم اٹھا کر لکھ دیتا ہے، اس سے ایک انارکی پیدا ہوتی ہے، ذہنی انارکی، سیاسی انارکی سے کہیں زیادہ خطرناک ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ ملکوں کی تاریخ میں پولیٹیکل انارکی سے پہلے منٹل انارکی اور اخلاقی انتشار پیدا ہوتا ہے، اسلام کے بارے میں ذمہ دارانہ طور پر عرض کر سکتا ہوں کہ اس کا ایک طالب علم ہوں، فاضل نہیں کہتا لیکن مانا ہوا طالب علم ہوں، اور یہ بال اسی طالب علمی میں سفید ہوئے ہیں کہ دین کے متعلق پہلے اس حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اس کا تعلق وحی الٰہی سے ہے، شریعت آسمانی سے ہے، اس کے لانے والے پیغمبر ہیں، یہودی تک اپنے دین وملت کے بارے میں غیور واقع ہوئے ہیں، آپ کسی یہودی سے یہ کہہ کر دیکھئے کہ تمہارا یہ مسئلہ غلط ہے، تمہارا یہ قانون غلط ہے تو وہ کہے گا

کہ ہمارے قانون کا تعلق شریعت موسوی سے ہے، بائبل سے ہے، ہم تو اس کے پابند ہیں، ساری دنیا بھی اگر کہے کہ یہ غلط ہے تو ہم اسے ماننے کے لیے تیار نہیں، چنانچہ آج بھی اسرائیل کا پورا نظامِ معاشرت، اور ان کا عائلی قانون اسی پر چل رہا ہے۔

یہودیوں کے ذکر پر مجھے ایک بات یاد آ گئی، اسرائیل سے ایک پرچہ نکلتا تھا، اس میں ایک مقدمہ کی کارروائی تھی، اس میں ایک مضمون تھا کہ اسرائیل کے عرب مسلمان باشندوں نے اسرائیل کی عدالت عالیہ میں یہ رٹ دائر کی کہ ہمیں تعدد ازواج کی اجازت دی جائے، اس لیے کہ ہمارے یہاں تعدد ازواج کی اجازت ہے، فاضل جج نے وقت مانگا، اس نے کہا کہ اسلام کے جو اوّلین ماخذ ہیں، اور جو کتابیں سند کا درجہ رکھتی ہیں، میں ان کا مطالعہ کروں گا، اسرائیل میں یہودیوں کی ایک بڑی تعداد عربی سے واقف ہے، وہ پہلے سے فلسطین میں رہتے تھے، وہ بے تکلف عربی بولتے ہیں، جج نے قرآن اور احادیث کا مطالعہ کیا، فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا، اس نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ میں بداہتاً اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تعدد ازواج کی قرآن وحدیث اور اسلامی شریعت میں کھلی اجازت ہے، اور ہم اس کا علمی وتاریخی طور پر انکار نہیں کر سکتے، لیکن چونکہ فلاں اسلامی ملک میں اس پر پابندی عائد کر دی گئی ہے، اس لیے اسرائیل کو جو ایک غیر اسلامی ملک ہے اور شریعت اسلامی کا پابند نہیں، ضرور اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ یہاں کی مسلم آبادی پر پابندی عائد کرے۔

پھر اس مسئلہ پر ملک اور اہل ملک کی توانائی کیوں ضائع کی جا رہی ہے ملک اور اہل ملک کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، ملک کی تعمیر وترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ غیر ضروری ذہنی انتشار، بدگمانی اور خوف کی فضا ختم کی جائے کوئی ملک اس طرح ترقی نہیں کر سکتا کہ اس کی آبادی کے مختلف عناصر میں اپنے مستقبل کے بارے میں شکوک وشبہات ہوں، اور اس سے بڑھ کر ملک کے لیے بدخواہی نہیں ہو سکتی کہ وہ توانائی جو ملک کی سالمیت، اس کی حفاظت اور تعمیر وترقی میں صرف ہونی چاہئے تھی، وہ شکوک وشبہات کو رفع کرنے میں یا شکوک وشبہات کی فضا میں زندگی گزارنے میں خرچ ہو، میں ایک قدم آگے بڑھا کر کہتا ہوں کہ

اگر ہم اس اندیشہ میں مبتلا ہیں کہ ہماری آئندہ نسل ہماری طرح ان چیزوں کی معتقد اور ان پر یقین کرنے والی نہیں ہوگی جن پر ہم اعتقاد رکھتے ہیں، اور جو ہمارے لیے ضروری ہیں تو مسلمانوں کے اندر ایک تذبذب اور اندرونی انتشار کی وہ کیفیت پیدا ہوگی جو صرف مسلمانوں کے لیے مضر نہیں ملک کے لیے بھی مضر ہے، یہ ہرگز دانشمندی کی بات نہیں ہے کہ جب ملک میں کوئی مصیبت نہیں آئی، کوئی سائیکلون نہیں ہے، کوئی ایمرجنسی کی کیفیت نہیں ہے، کوئی آسمان سے اولے یا گولے نہیں برس رہے ہیں، کسی نے اس لیے حملہ نہیں کیا ہے کہ آپ مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی کرائیے ورنہ ہم اس ملک پر قبضہ کرتے ہیں، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ وقتاً فوقتاً یہ آواز بلند ہوتی رہتی ہے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم کی جائے؟

۲۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ دین اسلام کے دائرہ کو سمجھ لیا جائے اس بارہ میں مذاہب میں خود اختلاف ہے، اور اس میں درجوں کا فرق ہے، کئی مذاہب ایسے ہیں کہ وحی و نبوت سے ان کا آغاز ہونے کے باوجود انھوں نے مذہبی زندگی کو ایک خاص دائرہ میں محدود کر لیا ہے، مثلاً عبادات کے دائرہ میں، لیکن اسلام کا معاملہ یہ نہیں ہے، اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے، یہ ایک اساسی حقیقت ہے جو عبد و معبود کے تعلق کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی، ہر مسلمان خدا کا فرمانبردار بندہ ہے، اور اس کا تعلق خدا سے دائمی ہے، عمومی ہے، عمیق بھی ہے اور وسیع بھی ہے، محدود بھی ہے جامع بھی، قرآن شریف میں ہے "يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَاتَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ط اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ". (۱) (اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے)۔

یہاں تحفظ نہیں رزرویشن نہیں کہ اتنا آپ کا اتنا ہمارا، اتنا ملک کا، اتنا اسٹیٹ کا، اتنا خدا کا، اور اتنا خاندان اور قبیلہ کا، اتنا دین وملت کا اور اتنا سیاسی مفادات کا نہیں، جو کچھ ہے سب خدا کا ہے، یہاں سب عبادت ہی عبادت ہے، مسلمان کی پوری زندگی عبادت ہے، مسلمان کی پوری زندگی خدا کے سامنے عاجزانہ غلامانہ ہے، اسلام خدا کے سامنے مکمل

(۱) سورۃ البقرۃ: ۲۰۸

سپردگی اوراپنے کو(Surrender) بلاشرط حوالہ کرنے کا نام ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت وراثت میں ہمارے اقتصادی حالات کا تقاضہ کچھ اور ہے، یہاں کی مجبوریاں، یہاں کے تمدنی تقاضے، معیارزندگی اور ہمارے خاندان کی پچھلی تاریخ، یہ سب اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہم وراثت تقسیم نہ کریں، ہم اس زمین کواسی طرح باقی رکھیں، کم سے کم لڑکیوں کوحصہ نہ ملے اس لیے کہ شادی کے بعد یہ حصہ ان کے گھروں کو چلا جاتا ہے، اس کا بالکل اختیار نہیں، اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ دین کا دائرہ پوری زندگی پر حاوی ہے، اوراس میں کسی کوبھی ترمیم کرنے کا حق نہیں، بڑی سے بڑی عدالت، بڑی سے بڑی قوت حاکمہ، اور بڑی سے بڑی ہیئت منتظمہ اور بڑی سے بڑی دانش گاہ اور یہاں تک کہ بڑے سے بڑے مجتہد اورامامِ وقت کوبھی ان چیزوں میں جوقرآن مجید میں منصوص وقطعی ہیں ایک لفظ، ایک نقطہ کی ترمیم کرنے کی اجازت نہیں ہے، یہ سارے علماء بیٹھے ہوئے ہیں ان کے سامنے کہہ رہا ہوں، اوراگر یہ بات غلط ہے تو ان کا دینی تبحر اوراحساس فرض انھیں مجبور کرے گا کہ یہ میری تردید کریں۔

ان دوحقیقتوں کواگر سمجھ لیا جائے کہ ایک تو یہ کہ یہ دین ہمیں وحی سے ملا ہے، پیغمبر کوبھی اس پرعمل کرنے کا حکم ہے، قرآن مجید میں صاف صاف آتا ہے "ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ". (۱) (اے پیغمبرؐ) ہم نے آپ کودین کے خاص طریقہ (شریعت) پرکردیا ہے تو آپ اسی پر چلتے جایئے، اور بے علموں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے) (۲)

نبی معصوم اور نبی محبوب سے یہ کہا جارہا ہے تو ہم سے کیسے مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ

---

(۱) سورۃ الجاثیہ: ۱۸

(۲) دینی احکام کا دوسرا ماخذ سنت ہے (جو وحی غیر متلو ہے) اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور آپؐ کا کسی فعل پر سکوت اوراس کا برقرار رکھنا ہے، اس پورے مجموعے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وما آتکم الرسول فخذوہ وما نہٰکم عنہ فانتھوا". (سورۃ الحشر: ۷) (اور رسول تم کو جوکچھ دے دیا کریں وہ لے لیا کرو، اور جس چیز سے تم کو روک دیں تم رک جایا کرو) سنت بھی حقیقۃً قرآن مجید کے کسی حکم کی تشریح، اجمال کی تفصیل یا اس سے استنباط کا نام ہے۔

ہم شریعت کو بدل دیں۔

یہ دو حقیقتیں ہیں جن کو سمجھنے کے بعد اس غلط فہمی کا پردہ ہی چاک ہو جاتا ہے اور ایک غیر ضروری صورت حال کا مقابلہ کرنے اور اس پر اپنی ذہانت صرف کرنے سے ہمیں چھٹی مل جاتی ہے، اور ملک وحکومت کو دوسرے ضروری کاموں کے لیے وقت بچ جاتا ہے۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی وحدت کے لیے، سالمیت کے لیے اور مشترک وطنی شعور کے لیے ضروری ہے کہ ایک مشترک واحد عائلی قانون (Uniform Civil Code) نافذ ہو، تو میں ایک سیدھی سی بات پوچھتا ہوں، اسکول کا بچہ بھی اس کا جواب دے سکتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم جو ہوئی تھی، وہ اصلاً وابتداءً برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ہوئی تھی، جرمن اور انگریز دونوں نہ صرف یہ کہ کرسچین ہیں بلکہ پروٹسٹنٹ بھی ہیں، اور ان کا عائلی قانون بالکل ایک ہے، یہ کوئی بھی شخص معلوم کر سکتا ہے کہ جہاں تک عیسائی قانون کا تعلق ہے ایک ہے، پھر یہ دونوں دشمنوں کی طرح کیوں لڑے؟ اگر یونیفارم سول کوڈ جنگ کو روک سکتا ہے اور نبرد آزمائی اور تصادم سے باز رکھ سکتا ہے تو اس کو وہاں روکنا چاہئے تھا، پھر دوسری جنگ عظیم کا بھی یہی حال تھا کہ کرسچین اور پروٹسٹنٹ جن کی تہذیب بھی، عائلی قانون بھی بلکہ معاشرت بھی ایک ہے، وہ اس طرح سے لڑے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، آپ عدالتوں میں بھی جا کر دیکھ آئیے کہ جو مقدمے آتے ہیں، مسلمان مسلمان کے خلاف مدعی ہے، مسلمان مسلمان کا مدعیٰ علیہ ہے، اور مسلمان مسلمان کی عزت کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے، اس کے گھر پر ہل چلا دینا چاہتا ہے، ان دونوں کا عائلی قانون بھی ایک ہے، بعض اوقات تو خون بھی ایک ہوتا ہے، دونوں فریق ایک نسل ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، درحقیقت اختلافات اور دشمنیوں کا تعلق نفسانیت سے، دولت پرستی کے جنون سے ہے، نفس پرستی اور مادیت سے ہے، اس غلط نظام اور نصاب تعلیم سے ہے، جس نے اخلاقیات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے، اس کا تعلق ہرگز عائلی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے، یہ میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ عائلی قانون ایک

ہو جانے سے اخلاقی صورت حال میں قطعاً ایک ذرہ کا فرق بھی نہیں پڑے گا، پھر کیوں بار بار اس کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ ہونا چاہیے، تاکہ آپس میں اتحاد والفت پیدا ہو۔

حضرات! جاننے والے جانتے ہیں کہ میرا اس گروہ اور خاندان سے تعلق ہے جس نے سب سے پہلے انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا، اور بیش از بیش حصہ لیا، کلکتہ کی یہ سرزمین خاص طور سے اس کی شہادت دیتی ہے کہ وہ ایمانی قافلہ حجاز جاتے ہوئے یہیں سے گزرا تھا، اسی خلیج بنگال سے روانہ ہوا تھا، اور اپنے مستقر سے یہاں تک ایمان، توحید وسنت اور دینی حمیت کی روشنی پھیلاتا ہوا آیا تھا(۱)، اسی نے سارے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جہاد کی روح پھونک دی (۲)، قرآن کہتا ہے کہ تمہیں عصبیت اور بغض اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کا دامن ہاتھ سے جانے دو، اور تعصب وحق پوشی سے کام لو۔

"وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ". (۳) (اورلوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو، انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے)۔

انگریز اس بارہ میں زیادہ سے حقیقت پسند تھے، انھوں نے جب ہندوستان میں حاکمانہ طریقہ پر قدم رکھا تو انھوں نے اچھی طرح یہ سمجھ لیا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے عائلی قانون میں دخل نہیں دینا چاہیے، ان کو اس میں آزاد رکھنا چاہیے، اسی کے نتیجہ میں ہندوستان میں محمڈن لا کا اتنا بڑا کام ہوا، اسی کلکتہ کی سرزمین پر اور خاص طور پر یادش بخیر رائٹ آنریبل جسٹس سید امیر علی کے ہاتھوں اور سرعبدالرحیم وغیرہ کے ذریعہ ہوا، انگریزوں نے دو کام بڑی عقلمندی کے کیے، انھوں نے اس بات کو پالیا کہ بے ضرورت

---

(۱) اس سے مراد حضرت سید احمد شہیدؒ کا وہ قافلہ ہے جو حج کی نیت سے شوال ۱۲۳۶ھ (جولائی ۱۸۲۱ء) میں اپنے مستقر رائے بریلی سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوا تھا، آغاز میں اس میں چار سو آدمی شریک تھے، راستہ میں اضافہ ہوتا گیا، کلکتہ سے روانگی کے وقت تک ۶۹۳ آدمی ہوگئے، یہ سفر رائے بریلی سے کلکتہ تک دریائے گنگا کے راستہ سے ہوا تھا، اور ہر جگہ اصلاح وتبلیغ کا عظیم الشان کام انجام پایا تھا۔

(۲) ملاحظہ ہو سرولیم ہنٹر کی کتاب (Our Indian Muslmans)

(۳) سورۃ المائدہ: ۸

جذبات کو مجروح نہیں کرنا چاہئے اور مشکلات نہیں پیدا کرنے چاہئیں، یہ ایک ایسی قوم کا طرز عمل ہوتا ہے جو حکمرانی کا تجربہ رکھتی ہے، انھوں نے دو باتیں طے کیں، ایک تو یہ کہ عائلی قانون اور مذہب میں مداخلت نہیں ہونی چاہئے، دوسری بات یہ کہ نظام تعلیم سیکولر ہونا چاہئے کہ بلی کتے کے قصے پڑھاؤ مگر کسی دوسرے مذہب کی تلقین نہ کرو ہم نے انگلش پرائمر اور ریڈریں پڑھی تھیں، ان میں شروع سے اخیر تک یہ دیکھا کہ جنوں اور بھوتوں پریتوں تک کے قصے اور افسانے آئے، جانوروں کے قصے آئے لیکن کہیں یونانی رومن دیومالا (Mythology) کی بات کرسچین میتھالوجی کی بات نہیں آئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اطمینان کی کیفیت رہی، وہ بنیادیں دوسری تھیں جن بنیادوں پر ہندوستان کے مسلمانوں نے اور دوسرے عناصر نے مل کر یہاں غلامی کا جُوا اپنے سر سے اتار کر پھینک دیا، اور جنگ آزادی لڑی، ان دونوں دانشمندانہ فیصلوں نے ان کی حکومت کی بقاء میں مدد کی اور اس کی مدت کو دراز کیا، ورنہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، اپنے تاریخ کے مطالعہ کی روشنی میں کہتا ہوں کہ جو واقعہ ۱۸۵۷ء میں پیش آیا وہ ۱۷۵۷ء میں پیش آسکتا تھا، اور پیش آنا چاہئے تھا، اور انیسویں صدی کے بالکل اوائل میں پیش آجانا چاہئے تھا، یہ سو برس سے زائد جو انھوں نے یہاں اطمینان سے حکومت کی، اس میں ان کی اس دانشمندی کو دخل ہے کہ باشندگان ملک کی مذہبیات میں ان کے عائلی قانون میں دخل نہ دو، ان کے نظام تعلیم میں دخل نہ دو، ان کو سیکولر طریقہ پر پڑھاؤ، اپنے اپنے مذہب کے مطابق یہ عقیدہ رکھیں، عمل کریں۔

میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان اگر مسلم پرسنل لا (شرعی عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کرلیں گے تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے، اور اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ نفسیات اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت وتہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی، اور مذہب معاشرت کے بغیر موثر ومحفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسجد میں آپ

مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اس لیے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت، نظام تمدن، اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اس کو دعوت ارتداد سمجھتے ہیں، اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے، جیسے دعوت ارتداد کا مقابلہ کیا جانا چاہئے، اور یہ ہمارا شہری، جمہوری اور دینی حق ہے، اور ہندوستان کا دستور اور جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقاء اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون واطمینان میں مضمر ہے۔

آخر میں آپ کے اس اعتماد واعزاز کا نیز آپ کی توجہ والتفات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کا آپ نے مجھے اپنے خیالات کے بے لوث وآزاد طریقہ پر پیش کرنے کی اجازت دے کر اظہار فرمایا۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين.

☆☆☆

شرعی عائلی قوانین پر عمل کرنے کے بارے میں
مسلمانوں کا غیر جانبدارانہ احتساب اور

دعوت فکر و عمل

وہ تقریر جو آل انڈیا مسلم پرسنل لا کانفرنس منعقدہ کلکتہ کے موقعہ پر
۷راپریل ۱۹۸۵ء کو شام میں شہید مینار میدان میں
مسلمانوں کے عظیم الشان جلسۂ عام میں کی گئی۔

شرعی عائلی قوانین پر عمل کرنے کے بارے میں
مسلمانوں کا غیر جانبدارانہ احتساب اور

دعوت فکر و عمل

۶، ۷؍اپریل ۱۹۸۵ء کو کلکتہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے مسلمانانِ کلکتہ کی دعوت پر ایک عظیم الشان آل انڈیا کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مؤقر ارکان، اور کلکتہ کے ممتاز ملّی و دینی کارکنوں کے ماسوا ہندوستان کے چیدہ و برگزیدہ علمائے دین، مسلم جماعتوں وتنظیموں کے سربراہ، اہم مدارس عربیہ کے ذمہ دار، ملک کے دانشور اور مسلمان ماہرین قانون کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی، بورڈ کے اجلاس منعقدہ ۶؍اپریل ۱۹۸۵ء کو مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے بحیثیت صدر بورڈ کے زبانی خطبہ ارشاد فرمایا جو اس وقت ریکارڈ کر لیا گیا تھا، کسی قدر تاخیر کے ساتھ وہ کیسٹ سے نقل کر کے ''مسلم پرسنل لا کی صحیح نوعیت و اہمیت'' کے عنوان سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے آفس خانقاہ رحمانیہ مونگیر بہار کی طرف سے حال میں شائع کر دیا گیا ہے، اور وہ پرسنل لا بورڈ کے مرکزی دفتر سے حاصل کیا جا سکتا ہے، اس خطبہ میں مسئلہ کے اصولی اور بنیادی پہلو آ گئے ہیں، اور مسلم پرسنل لا کے متعلق غلط فہمیوں کا پس منظر، ان کی نفسیات، الٰہی و آسمانی قانون و دنیاوی انسانی قانون کے نازک فرق اور یکساں سول کوڈ کے ملکی اتحاد کی راہ میں غیر موثر و غیر منطقی ہونے کو بڑی وضاحت و قوت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اجلاس کے آخری دن ۷؍اپریل ۱۹۸۵ء کو شہید مینار کلکتہ کے وسیع میدان میں سہ پہر کو عام اجلاس ہوا، جس میں محتاط اندازے کے مطابق پانچ لاکھ کا مجمع تھا، مولانا نے اس اجلاس میں (جس میں مسلمانوں کی وہ عظیم ترین تعداد تھی، جو عرصہ سے کسی جلسہ میں دیکھنے میں نہیں آئی، اور سارا مجمع گوش بر آواز تھا) خالص مسلمانوں کو مخاطب کیا، ان کا بے لاگ، بیباکانہ طریقہ پر احتساب کیا اور ان کو بتایا کہ ان سے خود اپنے مقدس عائلی قانون پر (جو خدا کا نازل کیا ہوا اور خدا کے پیغمبر کا پیش کیا ہوا ہے، اور جو سراسر کتاب و سنت پر مبنی ہے) عمل کرنے میں کتنی کوتاہیاں اور قانون شکنیاں ہو رہی ہیں، انھوں نے کتنے جاہلی رسوم اور غیر اسلامی قانون و رواج اختیار کر رکھے ہیں، اور وہ اپنے غیر اسلامی ماحول اور معاشرہ سے کتنے متاثر ہوئے ہیں، مولانا نے ان کو خود اپنا غیر جانبدارانہ احتساب کرنے اور (مولانا کے الفاظ میں) ''اپنے گھروں میں عدالتیں قائم کرنے، اپنا خود جائزہ لینے، اور اپنے خلاف خود فیصلہ

کرنے کی دعوت" دی، اور بتایا کہ الٰہی قانون پر عمل نہ کرنے اور اپنے خالق و مالک کی بندگی اور طاعت میں کوتاہی اور سرتابی کرنے کے اثرات کس کس شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، اور اس سے اس ملت کی بے وزنی، بے اثری اور کیسی کیسی مشکلات وجود میں آتی ہیں، یہ ایک داعی حق کی جس کے سامنے اسلاف کا اسوہ ہے صدائے احتجاج اور زخمی دل کی کراہ، اور اپنے ہم ملت افراد سے دردمندانہ شکایت اور مخلصانہ مشورہ اور استدعا ہے، جو ہر طرح بروقت و برمحل ہے کہ ہمارے ملک کا مسلم معاشرہ اس وقت اندرونی طور پر خطرناک قسم کے امراض اور کمزوریوں کا شکار ہے، اور اس کو بے لاگ احتساب اور اظہار حق کی ضرورت ہے، چونکہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کا اوّلین و بنیادی مقصد خود مسلم معاشرہ کی اصلاح اور معاشرت و تمدن اور عائلی زندگی کے الٰہی قوانین پر عمل کی دعوت ہے، یہ ہر دور کے علماء، نائبین رسول اور حاملین و شارحین شریعت کا فرض منصبی ہے، اس لیے اس تحریر کو کیسٹ سے نقل کر کے طبع کیا جا رہا ہے، امید ہے کہ وسیع سے وسیع تر پیمانہ پر اس کی اشاعت کی جائے گی، مساجد و مجالس میں اس کو سنایا جائے گا، اور ملک کی علاقائی زبانوں میں اس کا ترجمہ کر کے اس کو مسلمانوں کی بڑی سے بڑی تعداد تک پہونچانے کی کوشش کی جائے گی۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ اجلاس عام عصر بعد شروع کیا گیا تھا، متعدد علماء و زعماء نے تقریریں کیں، درمیان میں نماز مغرب کا وقت آ گیا، سارے مجمع نے مولانا کے پیچھے مغرب کی نماز ادا کی، لیکن جلسہ میں کوئی انتشار پیدا نہیں ہوا، اور مجمع میں کوئی کمی نہیں آئی، یہ بات بہت کم دیکھنے میں آئی ہے، اور اس سے مجمع کی سنجیدگی اور مقصد کی عظمت و اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، افسوس ہے کہ غیر مسلم (انگریزی، ہندی) پریس نے حسب عادت اس عظیم جلسہ کو نظر انداز کیا، اور بعض مقامی اخباروں میں اگر خبر آئی بھی تو ان الفاظ میں کہ "مجمع میں کئی سو آدمی تھے" یہ بات جہاں ان اخبارات کی غیر ذمہ دارانہ روش کی غماز ہے، وہاں ملک و حکومت کے ساتھ بدخواہی پر بھی دال ہے جس سے ملک کے حقیقی مسائل اقلیتی فرقوں کے جذبات و احساسات اور احتجاجی و تعمیری جلسوں کے حجم و رقبہ کو بھی چھپایا جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ صحیح رائے قائم کرنے اور دانشمندانہ اور جرأت مندانہ قدم اٹھانے سے قاصر رہتے ہیں، اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ملت اسلامیہ کو انگریزی و ہندی اخبارات کے ذریعہ باشندگان ملک اور ذمہ داران حکومت تک اپنی بات پہونچانے کی کس قدر ضرورت ہے۔

نیاز احمد
آفس سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ

یکم ذی قعدہ ۱۴۰۵ھ
۲۰ر جولائی ۱۹۸۵ء

حضرات! اس وقت ہندوستان میں رہ رہ کر مسلم پرسنل لا یعنی مسلمانوں کے عائلی قانون میں آئین سازی کے ذریعہ مداخلت کا مسئلہ اٹھتا رہتا ہے، اور ملک کے مختلف حصوں

سے آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں، غیر مسلموں کی طرف سے بھی (جن سے ہمیں کچھ زیادہ شکایت نہیں) مسلمانوں کے ترقی وتجد د پسند (Progressive) طبقہ کی طرف سے بھی۔

اس کے بہت سے اسباب بیان کئے جا چکے ہیں، اور وہ صحیح ہوں گے، لیکن میں ایک مذہبی انسان ہونے کے ناتے نیز مذہب کے طالب علم اور قرآن وسیرت کا مطالعہ کرنے والے انسان کی حیثیت سے اس کا کچھ اور سبب سمجھتا ہوں، کسی بزرگ کا مقولہ ہے کہ ''جب مجھ سے اپنے مالک، اپنے خدا کے معاملہ میں کوئی کوتاہی ہوتی ہے، میرے رات کے معمولات میں فرق آتا ہے، جس وقت میں اٹھتا ہوں، جتنی رکعتیں پڑھتا ہوں، خدا کو جس طرح یاد کرتا ہوں، اس سے دعا کرتا ہوں، اس کے سامنے روتا دھوتا ہوں، اس میں جب کوئی کمی ہو جاتی ہے تو میں فوراً اس کا نتیجہ دیکھ لیتا ہوں! اس کا نتیجہ کیا دیکھتا ہوں؟ یہ کہ میرے ملازمین میری بات اس خوش دلی کے ساتھ نہیں مانتے جس طرح پہلے مانا کرتے تھے، یہاں تک کہ جب میں سواری پر بیٹھنے لگتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ گھوڑا اس طرح اپنی پیٹھ نہیں جھکاتا اور اس طرح مجھے قبول نہیں کرتا جیسے وہ ہمیشہ قبول کرتا رہا ہے، میں سمجھ جاتا ہوں کہ میں نے اپنے مالک کے حق میں کوتاہی کی، تو یہ جن کو اللہ نے میرے اختیار میں دیا ہے مجھ سے سرتابی کر رہے ہیں، مجھے سبق دے رہے ہیں، میرے چٹکی لے رہے ہیں کہ نے اپنے آقا کے معاملہ میں کوتاہی کی، تم تو ہمارے آقائے مجازی ہو، ہم تمہارے معاملہ میں کوتاہی نہیں، سرتابی کریں گے'' کتابوں میں ان کے الفاظ بعینہٖ نقل کئے گئے ہیں ''اعرف ذلك فی خلق دابتی و خدمی'' (مجھے اپنی اس کوتاہی کی نحوست، اپنے جانوروں اور ملازمین کے طرز عمل میں نظر آ جاتی ہے)۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ عظیم مجمع جس تعداد کی نمائندگی کرتا ہے، اس تعداد کو چھوڑ دیجئے، وہ ساڑھے سات کروڑ ہے کہ پندرہ کروڑ، میں صرف اس مجمع کو سامنے رکھتا ہوں، میں کہتا ہوں کہ اس ملت کے افراد کتنی بڑی تعداد میں بھی ہوں، اور کس ذوق وشوق کے ساتھ اپنے علماء کی باتیں، خادمان دین کی باتیں سننے کے لیے جمع ہوں، کسی کو خیال بھی

نہ آتا (جرأت کرنا تو الگ ہے) کہ ان کے پسندیدہ، ان کے برگزیدہ اور ان کے مقدس قانون میں مداخلت کی جائے، کسی واقعہ کے کچھ اسباب ظاہری ہوتے ہیں، جن کو ظاہری آنکھیں دیکھتی ہیں، کچھ اسباب غیبی ہوتے ہیں جن کو قرآن مجید، سنت اللہ، اسوۂ رسولؐ وسیرت النبیؐ کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ جرأت بار بار اس لیے ہو رہی ہے کہ ہم سے اللہ کے اس مقرر کئے ہوئے مقدس قانون کی پابندی میں اور اس پر عمل کرنے میں شدید کوتاہی ہو رہی ہے، ہم اس قانون کو اپنے گھروں میں توڑ رہے ہیں، اپنے خاندانوں میں توڑ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کہیں ہمیں اس کی یہ سزا نہ دے کہ وہ قانون پھر قانونی طور پر توڑا جائے، یہ خدا کے طریقے ہوتے ہیں، وہ کبھی براہ راست سزا دیتا ہے، کبھی اپنی مخلوقات اور اپنے بندوں کے ذریعہ سزا دلواتا ہے، یہ عناصر اربعہ، یہ بحر و بر، یہ خشکی وتری، یہ موسم اور طاقتیں جو اس کائنات میں کام کر رہی ہیں "وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" یہ سب خدائی لشکر ہیں، پہلے ہم اس قانون کی حرمت اور اس قانون کا احترام اپنے گھروں میں کریں، زوجین اپنے آپس میں کریں، میاں بیوی اپنے تعلقات اور ان حقوق وفرائض میں کریں جو ان پر عائد ہوتے ہیں، ترکہ ومیراث کے قانون میں اس کا احترام کریں، اس کی پابندی کریں، نکاح وطلاق کے مسائل میں اس پر عمل کریں، پھر کسی کی مجال نہیں کہ دنیا میں وہ اس قانون کو چیلنج کر سکے، گردنیں جھک جائیں گی اور ساری دنیا سرافگندہ ہو جائے گی بلکہ اس کو شوق ہوگا کہ وہ آپ کے قانون پر چلے۔

لیکن جب ہم اس قانون کو اپنے گھر میں توڑیں گے تو پھر دوسروں سے توقع نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے قانون کا احترام کریں، آج آپ اپنا جائزہ لیجئے، دیانتدارانہ جائزہ لیجئے، اپنے خود آپ محتسب بنئے، اور اپنے لیے اپنے گھروں میں عدالتیں قائم کیجئے، اپنے مقدمے خود دائر کیجئے، آپ ہی مدعی بنئے، آپ ہی مدعا علیہ بنئے، اور دیکھئے کہ کتنے خدائی قانون ہیں، کتنے قرآن مجید کے منصوصات اور قطعیات ہیں، جن میں دنیائے اسلام کے دو عالموں کے درمیان بھی اختلاف نہیں، ان کو آپ کس طریقہ سے نظر انداز کر رہے ہیں،

آپ نے اپنی بہنوں کو ان کے والدین کی میراث (ترکہ) سے ان کا حصہ دیا؟ آپ نے نکاح وطلاق کے حق کو اس طرح استعمال کیا جس طرح اللہ اور اس کا رسول چاہتا ہے؟ کیا مسلمان شوہر نے اپنی بیوی کے اور مسلمان بیوی نے اپنے اپنے شوہر کے حقوق ادا کیے؟ کیا آپ کو مسائل کا علم ہے؟ تفصیلی علم تو بڑی چیز ہے، یہ علماء کا کام ہے، لیکن کیا آپ کو موٹی موٹی باتیں بھی معلوم ہیں، یہ ہمارا طرزِ عمل اس قانون کے معاملہ میں ہے، اس کی ہماری نظر میں (معاذ اللہ) پرکاہ کے برابر بھی قیمت نہیں، ہم ایک ادنیٰ مفاد کے لیے ادنیٰ درجہ کے فائدہ اور راحت کے لیے اس قانون کو پامال کرتے ہیں، اس قانون کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں تو ہمیں دوسروں سے کیا شکوہ؟

آج میں اس مجمع عظیم کو ایمانی زبان، قرآنی زبان میں خطاب کرتا ہوں، آپ کی عملی زندگی کا محاسبہ کر رہا ہوں، آپ خود دیکھئے کہ آپ اس قانون کا کتنا احترام کرتے ہیں، اس پر خاندانی روایات کو اور رسم ورواج کو کتنی ترجیح دیتے ہیں؟ اس پر اس کا اضافہ کیجئے جو آپ نے اپنے ہم وطنوں سے سیکھا ہے، جہیز کا بڑھا چڑھا مطالبہ ہم میں کہاں سے آیا؟ اس کو کسی نام سے یاد کیا جاتا ہو، یہ چیز کہاں سے آئی؟ مکہ مدینہ حرمین شریفین سے آئی ہے، قرآن مجید کے راستے سے آئی، یہ لعنت کہاں سے آئی؟ جب آپ اس کو قبول کرتے ہیں تو اللہ بطور سزا کے آپ کی غیرت ملی کو آپ کے وجود ملی کو بار بار نشانہ بناتا ہے۔

ایک ایسا آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ عطا فرمائی ہے، اور جو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ میں انسانوں کے قلوب ہیں، وہ ہمیشہ جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے، اس کو اپنے گناہ کا نتیجہ سمجھتا ہے، قرآن شریف میں صاف صاف ہے:۔

"وَمَآ اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ". (سورة الشوریٰ: ۳۰)

تم پر جو مصیبت آتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے، وہ تمہارے عمل کا

نتیجہ ہوتا ہے، (یہ بھی ایسی حالت میں ہے) کہ اللہ تعالیٰ بہت کچھ عفوودرگزر سے کام لیتا ہے۔

ورنہ قرآن میں یہ بھی ہے:۔

"وَلَوْيُوَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَاتَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّوَخِّرُهُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى، فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْراً". (سورہ فاطر:٤٥)

اگر اللہ تعالیٰ پکڑنے لگے انسانوں کوان کے عملوں پر تو سطح زمین پر کوئی چلنے والی اور رینگنے والی چیز باقی نہ رہے، لیکن وہ ان کوایک وقت مقرر تک مہلت دیئے جاتا ہے، سو جب ان کا وقت آجائے گا (تو ان کے اعمال کا بدلہ دے گا) خدا تو اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

بہت کچھ معاف کر دینے کے بعد اور درگزر کرنے کے بعد بھی معصیت کا، قانون شکنی کا اثر ظاہر ہوتا ہے، تو ہم جس بات کی شکایت کرتے ہیں (اور بجا طور پر شکایت کرتے ہیں) میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں، اور یہ بھی ایک ڈنکا ہی ہے، بانگ دہل اعلان کرتا ہوں کہ ہم لوگ (شرعی قانون میں قانون سازی کے ذریعہ مداخلت کی) جو شکایت کرتے ہیں، وہ شکایت بجا ہے، ہم شکایت کرتے رہیں گے، اور شکایت کرنا ہمارا حق ہے، ایک جمہوری ملک میں جہاں قانون چلتا ہو، جہاں ہر شہری کو برابر کا حق دیا گیا ہو، وہاں ہر شہری کو اور شہریوں کی ہر تنظیم کو اور آبادی کے ہر عنصر کے نمائندوں کو یہ حق ہے کہ پارلیمنٹ (ایوان قانون ساز) میں، اپنے قومی عوامی جلسوں میں، اپنی مجلسوں میں اور اخباروں کے کالموں میں، وہ اس بات کی شکایت کریں کہ ہمارا فلاں حق نہیں مل رہا ہے، ہمارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، کوئی ملک جس کی جمہوریت پر بنیاد ہو، جو جمہوری ہو، اس کے بغیر نہیں چل سکتا، حقیقت پسند حکومتیں اس بات کا اہتمام کرتی ہیں، کہ ان کے ایوان قانون ساز میں ایک حزب مخالف رہے، ایک اپوزیشن پارٹی ہو، تاکہ اس کے ذریعہ حکومت کو اپنی خامیاں معلوم ہوتی رہیں، اور اس کو ملک کی آبادی کو زیادہ مطمئن کرنے اور مطمئن رکھنے کا موقعہ ملتا رہے، اس لیے ہم اپنی حکومت سے شکایت کریں گے اور سو بار کریں گے، اور اس کو اس پر فخر ہونا چاہیئے کہ ہمارے ملک میں شکایت کرنے کا حق ہے، یہ حق سلب نہیں

کیا گیا ہے، ہمیں اپنی آواز بلند کرنے کا حق ہے، ہم اسی میں ملک کی فلاح سمجھتے ہیں، وہ ملک خطرہ میں ہے جہاں زبان بندی کا قانون نافذ کیا جائے، جہاں کسی کو کراہنے اور آہ کرنے کی اجازت نہ ہو، اس لیے ہمارے اس ملک کا یہ افتخار، ہمارے اس ملک کی یہ خصوصیت، باقی رہنی چاہئے، ہم ہمیشہ اپنے آئین ساز بھائیوں سے اور ارکانِ حکومت سے، انتظامیہ (Administration) اور حکمراں جماعت سے شکایت کریں گے۔

لیکن جب ہم اہل حکومت اور برادران وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ سے شکایت کرنے کا حق کیوں نہ ہو؟ ان سے شکایت کریں گے اور ان کا دامن پکڑیں گے، لیکن آپ کا گریبان پکڑلیں گے، اور وہ ہاتھ ہمارا نہیں ہوگا، وہ دینی احتساب کا ہاتھ ہوگا، وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا جو آپ کا گریبان پکڑے گا، اور کہے گا کہ پہلے تم اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھو کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو، تمہاری نگاہوں میں اس قانون کی کتنی حرمت ہے؟ تم جہاں اس قانون کو چلا سکتے ہو وہاں چلا رہے ہو کہ نہیں؟ تم تو اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے قانون کو چلائے، اس کا احترام کرے۔

میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں، یہاں سے یہ عہد کر کے جایئے کہ اب قانون شریعت پر چلیں گے، یہ جہیز کی کیا مصیبت ہے؟ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کیے جاتے ہیں، ان کے پورا نہ ہونے پر یہ معصوم لڑکیاں جلا دی جاتی ہیں، ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں، صرف دہلی میں ہر بارہ گھنٹے پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے(۱)، کیا اس کائنات کے خالق اور نوع انسانی کے مربی (جس کی مخلوق مرد وعورت دونوں ہیں) کو یہ چیز گوارا ہو سکتی ہے؟ کیا اس ظلم کے ساتھ کوئی ملک کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے، خدا کی رحمت ونصرت کا مستحق ہو سکتا ہے؟ آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی ہمت نہیں ہونی چاہئے تھی، میں نے دہلی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

"وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ

---

(۱) قومی آواز دہلی، ۱۰؍جون ۱۹۸۴ء

يَسْتَغْفِرُوْنَ". (سورة الانفال:۳۳)

اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے انھیں عذاب دیتا، اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور انھیں عذاب دے۔

رحمۃ للعالمین کا وجود موجود ہے، آج رحمۃ للعالمین ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن رحمۃ للعالمین کی امت موجود ہے، آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہندوستانی سماج میں، ہندوستان کے معاشرہ اور سوسائٹی میں یہ ظلم ہو، اس کو عقل قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، آپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں ہونا چاہئے تھا، چہ جائیکہ آپ کے ہاتھوں ہو، عہد کیجئے کہ آپ اسلامی طریقہ پر شریفانہ انسانی طریقہ پر، شادی کا پیام دیں گے، آپ لڑکی مانگیں گے، اپنے لیے رفیقہ حیات کی تلاش کریں گے، بیٹے کے لیے پیام دیں گے، جہیز کے لیے آپ کے بڑھے چڑھے مطالبات نہیں ہوں گے کہ ہمیں یہ ملنا چاہئے، وہ ملنا چاہئے، لڑکوں کو اور ان کے وارثوں اور بزرگوں کو اس کا عہد کرنا چاہئے کہ ہم اپنے یہاں تو کیا، ہم اس ملک سے اس رسم کو ختم کریں گے۔

ایسا ہی ترکہ شرعی طریقہ پر تقسیم ہونا چاہئے، نکاح شرعی طریقہ پر ہونا چاہئے اور عورتوں کی بیویوں کی تعداد وہی ہونی چاہئے جو شریعت میں بیان کی گئی ہے، طلاق کا مسنون طریقہ معلوم کرنا چاہئے، مسنون اور افضل طریقہ کیا ہے؟ پھر اس کے بعد فقہی طلاق جس سے طلاق واقع ہوجاتی ہے، اس کو سمجھنا چاہئے کہ طلاق رجعی کیا ہوتی ہے؟ طلاق بائن ومغلظہ کیا ہوتی ہے؟ پھر اس میں طلاق کو آپ یہ سمجھیں کہ طلاق ابغض المباحات ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جائز ہے لیکن آخری درجہ کی چیز ہے، بڑی مجبوری کی چیز ہے، جو اپنے کو حرام چیزوں سے اور زندگی کو تلخ بننے سے بچانے کے لیے بہت مجبوری سے دل پر پتھر رکھ کر اختیار کی جاتی ہے، یہ نہیں کہ طلاق ایک فیشن ہوگیا ہے، جو لوگ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے ہیں اس میں تھوڑی سی ہماری کوتاہی کو بھی دخل ہے، جتنا طعنہ دیتے ہیں، اتنے کے مستحق تو ہم ہرگز نہیں ہیں (۱) ہم جانتے ہیں کہ

---

(۱) مسلمانوں میں طلاق کی شرح وہ نہیں ہے جو بیان کی جاتی ہے، اس میں مبالغہ اور رنگ آمیزی سے کام لیا جاتا ہے، پھر بھی تھوڑی سی بے اعتدالی ضرور ہے۔

یورپ میں کیا ہوتا ہے؟ وہاں کا معاشرہ کس طرح برباد ہورہا ہے، وہاں ساری عمر ناجائز طریقہ پر جنسی تعلق قائم رکھنا جائز ہے، کوئی اس کو نہیں ٹوکتا، لیکن طلاق دینا معیوب ہے، اوراس میں ہزار دقتیں ہیں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ہم اپنے قانون سے ہرگز شرمندہ نہیں، ہم اس کے ایک ایک نقطہ کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہیں، ہمارے علماء نے اس پر ایک کتب خانہ تیار کردیا ہے "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" (۱) ندوۃ العلماء لکھنؤ، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کا مرکزی دفتر واقع مونگیر برابر لٹریچر شائع کرتا رہتا ہے، عربی میں تو پوچھنا ہی کیا، اس میں علامہ عباس محمود العقاد، ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کی عورتوں کے حقوق پر اور اسلام میں عورتوں کے درجہ پر ایسی معرکۃ الآراء کتابیں نکل چکی ہیں، جن کی مثال نہیں مل سکتی، اور اس کے علاوہ بھی انگریزی میں اور مغربی زبانوں میں کام ہوا ہے، کوئی شخص ہم سے آنکھیں ملا کر کہدے کہ اسلام کا عائلی قانون ظالمانہ ہے، ہم اس سے پوچھیں گے کہ اس نے کیا پڑھا ہے؟ اس نے کتنی کتابیں پڑھی ہیں، کتنا وقت صرف کیا ہے محمڈن لا کے مطالعہ میں؟ ہم اس کا امتحان لیں گے، ہم اس کو بغیر امتحان لئے نہ چھوڑیں گے، ہم پوچھیں گے کہ تم طلاق کو کیا جانتے ہو؟ تم ترکہ کے متعلق کتنا جانتے ہو؟ اس لیے کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ جو چاہا وہ منھ سے نکال دیا، یہ پریس کا زمانہ ہے، یہ ابلاغ عامہ کے ذرائع کا زمانہ ہے، دنیا میں کوئی آدمی کہیں الگ تھلگ نہیں رہتا ہے، ساری دنیا گھر آنگن بنی ہوئی ہے، ہم سب جانتے ہیں کہ یورپ میں کیا ہورہا ہے، امریکہ میں کیا ہورہا ہے، اب علماء بھی ایسے نہیں رہے کہ آپ ان سے کہئے کہ آپ جانتے نہیں زمانہ کدھر جارہا ہے، آج علماء بیسیوں جدید تعلیم یافتہ حضرات سے زیادہ جانتے ہیں، کہ زمانہ کدھر جارہا ہے، معترضین آئیں، ہم سے باتیں کریں، اپنا عائلی قانون سامنے رکھیں، اور یورپ وامریکہ کا ترقی یافتہ سے زیادہ ترقی یافتہ قانون سامنے رکھیں، اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ آپ جس سے چاہیں کہہ دیں کہ آپ جانتے نہیں ہیں، اگر کوئی کہے گا، تو ہم اس کا امتحان

---

(۱) Academy of Islamic Research & Publications, Nadwatul Ulama, Lucknow

لیں گے کہ آپ کو کہنے کا حق ہے کہ نہیں، آپ (Qualified) ہیں کہ نہیں، اس کے بعد پھر ہم آپ کی بات توجہ سے سنیں گے۔

تو بھائیو! ہم اپنے قانون سے ہرگز شرمندہ نہیں، ہم یہاں نہیں بلکہ واشنگٹن میں، پیرس میں، لندن میں، نیویارک میں، آپ کہیں سیمینار منعقد کریں، ۱۹۵۱ء میں پیرس میں وہاں کی جامعات (Universities) اور فضلاء و ماہرین قانون کے زیر اہتمام فقہ اسلامی کا ہفتہ منایا گیا، اس میں مشرق وسطی کے فاضل ترین علماء و ماہرین قانون اور پروفیسر صاحبان بھی مدعو کئے گئے، وہاں کے بڑے بڑے جیورسٹ، بڑے بڑے قانون دانوں نے اور اعلیٰ درجہ کے پروفیسروں نے برملا کہا کہ اسلامی فقہ ہمارے قانون سے زندگی کے بہت سے شعبوں میں ابھی بہت آگے ہے، انھوں نے کہا کہ فلاں چیز میں حنفی قانون تک ابھی ہم نہیں پہونچے، اور فلاں شعبہ میں حنبلی فقہ کو ہم نہیں پہونچے، معاملات میں، بیوع میں، ملکیت کے معاملہ میں، شہادت کے مسائل میں فلاں فقہ تک ہم ابھی تک نہیں پہونچ سکے، ۱۸۵۷ء کے کچھ بعد کے زمانہ میں (جب علی گڑھ میں .M.A.O کالج قائم ہوا تھا) سمجھا جاتا تھا کہ دین کی نمائندگی کرنے والے دنیا سے بے خبر ہیں، اب سب پردے اٹھ چکے ہیں، اب سب کو سب کا کچا چٹھا معلوم ہے، ہمارے اسی مجمع میں ایسے لوگ موجود ہیں، جو ایک بار نہیں، پانچ پانچ بار اور دس دس بار یورپ جا چکے ہوں گے، ہم احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہیں، ہم فخر کرتے ہیں، اللہ کا شکر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایسے اعلیٰ درجہ کے قانون سے نوازا ہے۔

حضرات! اسی لہجہ میں اور اسی خود اعتمادی کے ساتھ ہم اپنے غیر مسلم فاضل بھائیوں سے بات کریں گے، لیکن ہم آپ سے دوسرے لہجہ میں بات کریں گے، آپ ہمارے بھائی ہیں، آپ کا ہم پر حق ہے، ہمارا آپ پر حق ہے، آج آپ نے ہمارے پیچھے نماز پڑھی ہے، تو آپ ہماری بات بھی سنئے اور غور کیجئے کہ آپ اپنے گھروں میں، اپنی عائلی زندگی میں اس قانون پر کتنا عمل کرتے ہیں، آپ اس قانون کو توڑیں اور دوسروں سے کہیں کہ وہ جوڑیں، یہ انصاف کی بات نہیں، ان سے ہم نہیں کہیں گے کہ ہمارے مسلمان توڑتے ہیں، یہ ہم آپ

سے کہیں گے، حقیقت حقیقت ہے، صداقت صداقت ہے، ضرورت ضرورت ہے۔

میرے بھائیو! آپ مجھے معاف کریں، میرے آپ کے صوبہ سے بہت قریبی تعلقات ہیں، میرے بزرگوں نے آپ کے خطّہ کا دورہ کیا ہے، یہاں انھوں نے اپنا پسینہ بہایا ہے، یہ وہ کلکتہ شہر ہے جب حضرت سید احمد شہیدؒ کا قافلہ یہاں آیا(۱) تو یہاں کے شراب کے ٹھیکیداروں نے سرکار انگریزی کو جس کا کلکتہ کیپٹل اور سیاسی مرکز تھا، درخواستیں گزاریں کہ جب سے یہ قافلہ آیا ہے اس وقت سے ایک آدمی بھول کر بھی ہمارے شراب خانوں میں نہیں آیا، ہم ٹیکس نہیں ادا کر سکتے، حکومت نے اس سلسلہ میں تحقیقات کیں، معلوم ہوا کہ واقعی جب سے شمالی ہند کی طرف سے یہ قافلہ آیا ہے اس وقت سے لوگوں نے شرابیں چھوڑ دی ہیں، ہزاروں، لاکھوں آدمیوں نے توبہ کر لی ہے، اوران شراب خانوں کی بکری بند ہوگئی ہے، تو کہا گیا کہ اچھا اس وقت ادا نہ کرو، لیکن قافلہ کے جانے کے بعد ہم پھر دیکھیں گے کہ اگر اس کے بعد بھی مسلمان شراب نہیں لیتے، نہیں پیتے تو ہم معاف کر دیں گے، ورنہ تمھیں دینا پڑے گا، سید صاحب اوران کے ہمراہیوں کو معلوم ہوا کہ بہت سے لوگوں نے بغیر نکاح کے عورتوں کو اپنے گھروں میں بٹھا رکھا ہے تو ایک مستقل کام یہ تھا کہ نکاح پڑھائے جاتے تھے، اور توبہ کرائی جاتی تھی، اور ازدواجی تعلقات شرعی طریقہ پر قائم ہوتے تھے، یہ بھی معلوم ہوا کہ بہت سی جگہ نکاحی عورتوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہے، جس کے دل میں جتنا آتا ہے، عورتوں کو اپنے گھروں میں ڈال لیتا ہے، شرعی پردہ کا رواج بھی بہت کم ہے، یہ کمزوریاں مختلف علاقوں میں تھیں، ہمارے مصلحین، شریعت کے نمائندے اس کے خلاف صف آرا ہوئے، اور کوششیں کیں (۲)، آج پھر مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذریعہ ہم اس بات کا مطالبہ کریں گے کہ تمام غیر شرعی رسوم، جاہلیت کی تمام رسمیں اور خاص طور پر یہ کہ ہم نے بجائے اپنے برادران وطن کو اسلام کی نعمت اوراس کا تحفہ دینے کے ہم نے ان کی

---

(۱) ۱۲۳۶ھ-۱۸۲۱ء کا واقعہ ہے، قافلہ میں جو دریائے گنگا کے راستہ سے درمیانی شہروں اور قصبات میں تبلیغ ودعوت کا کام کرتا ہوا، تین مہینے سے زائد مدت میں کلکتہ پہونچا تھا، سات سو کے قریب آدمی تھے، جو کلکتہ سے حج کے لیے روانہ ہونے آئے تھے، تین مہینے اس مبارک قافلہ کا قیام کلکتہ میں رہا۔

(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' جلد اول، ص: ۳۱۵-۳۲۰

جو کمزوریاں ان سے لی ہیں، ان کمزوریوں کو واپس کریں، ان سے کہیں کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لیجئے، آپ کے یہاں بیوائیں کس حال میں زندگی گزار رہی ہیں، آپ کے یہاں نکاح ثانی نہیں ہے، آپ کے یہاں ترکہ نہیں ہے، آپ کے یہاں عورت کو ملکیت کے حقوق حاصل نہیں ہیں، اور آپ ہم سے کہتے ہیں کہ تمہارا قانون ظالمانہ ہے، تم اپنے قانون کی اصلاح کرو۔

حضرات! میری تقریر بہت لمبی ہوگئی، لیکن میں آپ کو داد اور شاباشی دیتا ہوں کہ آج پہلی مرتبہ میں نے یہ دیکھا کہ نماز کے بعد مجمع پھر آ گیا، اور اسی طریقہ سے بیٹھا، یہ ایک تاریخی ریکارڈ ہے، میں آپ کی، بنگال کے مسلمانوں کی، کلکتہ کے مسلمانوں کی تعریف کرتا ہوں کہ آپ پھر نماز پڑھ کر ایسے آ گئے، جیسے آپ گئے ہی نہیں تھے، اللہ تعالیٰ آپ کے اس جذبہ کو اور آپ کے اس دین کے شوق کو قائم رکھے، لیکن مبارک ہوگا یہ جلسہ، تاریخ ساز ہوگا یہ جلسہ، اور ساری محنتیں وصول ہیں آنے والوں کی، بلانے والوں کی، اور خرچ کرنے والوں کی، اگر آپ یہ طے کرلیں کہ خلاف شرع رسمیں اب ہمارے گھر میں نہیں رہیں گی، اور ہم شریعت کے قوانین پر چلیں گے، تو پھر دیکھئے گا، کہ آسمان سے برکتیں نازل ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ دلوں میں انقلاب پیدا کر دے گا، آپ کے قانون میں مداخلت کی کوئی آواز نہیں اٹھے گی، لیکن جب تک کمزوری خود ہمارے یہاں ہے، آواز اٹھتی رہے گی، اس آواز کے اٹھنے کا جواز نہیں، میں صاف کہتا ہوں، ہم اگر کچھ بھی کریں جب بھی کسی جمہوری ملک میں اس کا جواز نہیں کہ ہمارے بنیادی اور مذہبی حقوق پر دست درازی کی جائے، لیکن آپ کو خود اپنی اصلاح پہلے کرنی چاہئے، اصلاح گھر سے شروع ہوتی ہے، میں ان الفاظ پر اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین.

☆☆☆

حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ
اور ملت کے لیے ایک فکر انگیز اور ولولہ خیز پیغام

خطبۂ صدارت

اجلاس ہشتم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
منعقدہ ۱۵، ۱۶/ دسمبر ۱۹۸۶ء، بمبئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ وحدہ والصلاۃ والسلام علی من لا نبیّ بعدہ!

حضرات! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنا خطبہ دو بیش قیمت تاریخی، فکر انگیز اقتباسات سے شروع کروں، جو ہمارے ملک کے سیاسی وانقلابی، اصولی واخلاقی اور جمہوری وسیاسی تاریخ میں سنگ میل اور روشنی کے میناروں کی حیثیت رکھتے ہیں، اور جن سے اس ملک کی سیاسی، انتظامی وفکری قیادت اور عوام کو ہمیشہ روشنی ورہنمائی حاصل کرنی چاہئے اور کبھی ان کو فراموش اور نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

پہلا اقتباس جنگ آزادی کے نہ صرف معتبر ومستند بلکہ قابل فخر ومایۂ ناز قائد ومحسن مولانا ابوالکلام آزاد کے اس خطبۂ صدارت کا ہے جو انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس رام گڑھ مارچ ۱۹۴۰ء میں دیا تھا۔

مولانا نے فرمایا:۔

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے، اور میرے فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں، بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرہ میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں، اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔

لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے، میں فخر کے

ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے، میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں، میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا''۔(۱)

دوسرا اقتباس ملک کے مشہور دانشور، محبِّ وطن بین الاقوامی شہرت کے حامل، ماہر تعلیم، اور سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کے اس خطبہ کا ہے، جو موصوف نے کاشی ودیا پیٹھ (بنارس) کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ۱۴/اگست ۱۹۳۵ء کو پڑھا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:۔

''آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خودغرضیاں، تنگ نظری اور دیش کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے، وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے، اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں، اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں، اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا، سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہونچ جائے گا۔

گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما(۲)

---

(۱) خطبات آزاد، مطبوعہ ساہتیہ اکادیمی، ص:۲۹۷-۲۹۸

(۲) ترجمہ: اگر چہ ہم غنچہ کی طرح دل گرفتہ اور غمزدہ ہیں، لیکن ہم اگر نہ رہے تو گلستاں بھی نہ رہے گا۔ (تعلیمی خطبات (ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم) مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی، فروری ۱۹۵۲ء، ص:۲۳-۲۴)

حضرات!

ہندوستان جیسے عظیم ملک میں جو مختلف مذاہب، تہذیبوں، زبانوں اور معاشرتی وعائلی نظاموں کا صدیوں سے مرکز چلا آرہا ہے، اور جس نے اپنی طویل تاریخ کے تسلسل میں اس حقیقت کے نہ صرف اعتراف بلکہ احترام، اس خصوصیت کے نہ صرف باقی رہنے کی اجازت بلکہ اس کے تحفظ وترقی اور اس کے ساتھ بقائے باہم اور مشترک ملکی اور قومی مفادات میں سرگرم اشتراک وتعاون کا ثبوت دیا ہے، اور جس کے لئے نامذہبی (Secular) اور جمہوری طرز حکومت (بشرطیکہ وہ پوری غیر جانب داری اور ذہن وضمیر کی صفائی کے ساتھ ہو) سب سے زیادہ سہل العمل، بے خطر اور قابل قبول نظام ہوسکتا ہے، یہی طرز فکر مناسب ہے، اور یہ نہ صرف کہنے والوں کی، اپنے اپنے ایمان وعقیدہ اور قلب وضمیر کی صحیح ترجمانی ہے، بلکہ حقیقت پسندی، سچی حب الوطنی، اقوام وملل، تمدنوں وتہذیبوں، اور علوم وفلسفہ کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا نچوڑ اور کہنے والوں کی بلند نگاہی، روشن ضمیری، اصول پسندی اور اس کے ساتھ اس اخلاقی جرئت کا نمونہ ومظاہرہ بھی ہے، جو ان دونوں قائدین فکر وسیاست کے ہر طرح شایان شان ہے۔

اسی حقیقت پسندی اور صحیح جمہوریت کے قیام اور ملک کے مختلف فرقوں، آبادی کے مختلف النوع عناصر اور قلیتوں کو مطمئن رکھنے اور ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو (جو ملک کا قیمتی سرمایہ ہے) اپنے مذاہب وعقائد، اپنے تمدنوں وتہذیبوں اور اپنے معاشرتی وعائلی اصولوں اور نظاموں کی حفاظت ودفاع میں صرف کرنے کے بجائے ملک کی تعمیر وترقی، اس کی سالمیت کی حفاظت اور اس کے استحکام اور بین الاقوامی عزت ومقام کے کام پر مرکوز رکھنے کے لئے دستور ہند میں دفعہ ۲۵ شامل کی گئی جس کا تعلق بنیادی حقوق سے ہے، اور جس میں ہندوستانی شہریوں کو پوری مذہبی آزادی دی گئی ہے، اس دستور کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

''امن عامہ'' اخلاق اور صحت اور نیز اس حصہ میں مندرج دوسرے دفعات کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام اشخاص کو ضمیر کی آزادی اور آزادانہ طور پر

مذہبی عقیدہ رکھنے، اس پر عمل کرنے اور تبلیغ واشاعت کا یکساں حق ہوگا''۔

یہ دفعہ ہندوستان کی سیاسی، نسلی، تمدنی، تہذیبی، مذہبی ونفسیاتی صورت حال کے عین مطابق تھی، اور اس پر پوری دیانت داری، خلوص اور عزام وفیصلہ کے ساتھ عمل کرنے کی ضرورت تھی۔

لیکن اس قابل احترام دستور ہند کا جس میں ملک کے ماہرین قانون اور دستور سازوں کی بہترین ذہنی، قانونی صلاحیتیں صرف ہوئیں، جس نے بہت وقت لیا، اور جس کے ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک نقطہ اور شوشہ پر طویل اور عمیق بحثیں اور موشگافیاں ہوئیں، یہ عجیب وغریب تضاد بلکہ دنیا کی دستور سازی کی تاریخ کا ایک معمہ ہے کہ اس کے بعد ہی دفعہ ۴۴ کی شکل میں یکساں مدنی قانون (Uniform Civil Code) کی دفعہ شامل کی گئی، اور اس کو دستور ہند کے رہنما اصول (Directive Principal) کا درجہ دیا گیا، اس دستور کا متن حسب ذیل ہے:۔

''مملکت، ہندوستان کے پورے قلمرو میں شہریوں کے لیے یکساں مدنی ضابطہ (Uniform Civil Code) کے حصول کی سعی کرے گی''۔

جس وقت دستور کی ترتیب عمل میں آئی تھی، اس وقت مسلم زعماء کو اطمینان دلایا گیا تھا کہ دستور ہند کے بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کی دفعات کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کو محفوظ کر دیا گیا ہے، اور بنیادی حقوق کی دفعات رہنما اصول سے زیادہ اہم ہیں، لیکن دور بیں نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ جہاں تک مسلمانوں کے عائلی قوانین اور نظام معاشرت کا تعلق ہے (جو ان کے مذہب کا جزء لاینفک (Inseparable Part) ہے، دستور ہند کے اس تاروپود میں ایک آتش گیر (Explosive Matter) مادہ رکھ دیا گیا ہے، جو کسی وقت بھی کسی ادنیٰ تحریک، یا باہر کی گرم ہواؤں کے اثر سے آگ پکڑ سکتا ہے، اور ان مذہبی وقانونی تحفظات کو جلا کر فنا کر سکتا ہے، جن کی دستور نے ضمانت دی تھی، چنانچہ واقعات کی قدرتی رفتار، اور ان مختلف عوامل ومحرکات

(Factors)کے ماتحت جن کا تعلق مسلمانوں کے عائلی قانون(Personal Law) کی صحیح نوعیت اوراس کے ان کے مذہب سے تعلق اوراس سلسلہ میں مسلمانوں کے عقائد وجذبات اور نفسیات سے ناواقفیت،فکرونظر کی سطحیت سے بھی ہے،اور ہندو احیائیت(Hindu Revivalism)کے جذبہ اور سیاسی وانتخابی مصالح اوراکثریت کوخوش کرنے کے جذبہ سے بھی ہوسکتا ہے،یہ خطرہ سامنے آگیا،اورایک عرصہ کی خاموشی کے بعد۱۹۷۲ء میں مختلف اسباب ومحرکات کی بناء پر ہندوستان میں مختلف فرقوں کے عائلی قانون(Personal Law) کی وحدت اور مسلم پرسنل لا کی اصلاح وترمیم کی پھرایک بار بلند آہنگی کے ساتھ آواز بلند ہوئی، یہ آواز تھوڑے تھوڑے وقفوں کے ساتھ مختلف وقتوں میں مجلس قانون ساز کے اندراور مجلس قانون ساز کے باہر بلند ہوتی رہی،لیکن مختلف سیاسی مصلحتوں سے اور مسلم رائے عامہ کی برہمی کے خوف سے(جس کا الکشن پر بھی اثر پڑنے کا خطرہ تھا)دبائی جاتی رہی،اور حکومت ہند نے کئی بار اپنے اعلیٰ ذمہ داروں کی زبان سے اس کا اعلان کیا کہ ایسا کرنے کی اس کی کوئی نیت نہیں ہے،اور جب تک متعلق فرقے خوداس خواہش کا اظہاراوراس کا مطالبہ نہ کریں اس کواس مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں،لیکن اسی کے ساتھ خودان فرقوں کے متعدد افراد پارلیمنٹ کے اندراور پارلیمنٹ کے باہر یہ آواز اٹھاتے رہے،اور بعض دوربین نگاہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ محض ان کے ضمیر کی آواز نہیں ہے، بلکہ ان کی زبان حال کہتی ہے کہ ؎

از پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
انچہ استاد ازل گفت ہمہ می گویم

حقیقت جو کچھ بھی ہو اتنا اندازہ ہوگیا کہ ملک کے قانون سازوں اور ارباب اختیار کے ذہن اس معاملہ میں صاف نہیں ہیں،اور کسی وقت بھی خاکستر کے نیچے کہ یہ چنگاریاں شعلہ بن کر بھڑک سکتی ہیں۔

اس مسئلہ کے دو بڑے محرک ہیں،ایک یہ کہ ''سلطانی جمہور'' کے اس دور میں

قانون سازی کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط سمجھا جاتا ہے اور عائلی قوانین زندگی کا ایک ایسا اہم شعبہ ہے، جو افراد کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، اور افراد کو ایک دوسرے سے مربوط بھی رکھتا ہے، جن قوموں یا مذہبی فرقوں میں ''آسمانی قانون'' کا کوئی تخیل یا عقیدہ نہیں ہے، اور وہ عائلی قوانین کو محض زندگی کے تجربات کا نتیجہ اور خواہشات وضروریات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں، (اور بدقسمتی سے دو بڑے آسمانی مذہبوں، اسلام اور یہودیت کے علاوہ عام طور پر مذہبی قوموں اور فرقوں، بالخصوص آریائی نسلوں میں یہی تخیل پایا جاتا ہے) ان قوموں اور فرقوں میں اس قانون میں حالات اور ضروریات کے مطابق تبدیلی اور زندگی سے اس کی مطابقت کا احساس اور مطالبہ بالکل قدرتی امر وبدیہی حقیقت ہے، اس لئے کہ وہ انسانوں ہی کے اپنے اپنے زمانہ کے مطابق بنائے ہوئے قوانین ہیں، زمانہ بدل جانے اور حالات تبدیلی ہو جانے سے انسانوں ہی کے ہاتھوں ان میں اصلاح وترمیم اور تبدیلی نہ صرف جائز بلکہ بعض اوقات فرض وواجب ہو جاتی ہے۔

دوسرا بڑا محرک کسی ملک کی آبادی کے مختلف عناصر اور اجزاء میں زیادہ سے زیادہ ہم رنگی ووحدت (Uniformity) کا وہ عالمگیر رجحان ہے، جس کا تقریباً اس صدی کے اوائل سے بڑی قوت وشدت کے ساتھ پروپیگنڈہ کیا گیا، اور اس میں ادب وشاعری، علم وسیاست، اور صحافت وخطابت سب نے پورا حصہ لیا ہے، یورپ سے (جہاں کے اکثر ملکوں میں ایک ہی تہذیب، ایک ہی معاشرتی نظام، ایک ہی عائلی قانون اور اکثر ایک ہی مذہب اور زبان رائج ہے) یہ خیال ان مشرقی وایشیائی ممالک میں آیا جہاں کئی کئی مذہب مختلف تہذیبیں اور مختلف معاشرتی وعائلی نظام پائے جاتے ہیں، لیکن یہ مذاہب، تہذیبیں، اور مختلف معاشرتی وعائلی نظام کبھی کبھی باہمی نفرت، زور آزمائی اور انتشار کا باعث نہیں ہوئے، انتشار وافتراق کا اصل سبب ہمیشہ ملکوں کے سیاسی اغراض اور قوموں کے سیاسی رہنماؤں کے ذاتی مفادات ثابت ہوا ہے، خود یورپ میں مکمل مذہبی، تہذیبی اور عائلی وحدت کے باوجود دو، دو خوں آشام جنگیں ہو چکیں، جن کے شعلوں سے مشرق وایشیا

کا دامن بھی نہیں بچ سکا، پہلی جنگ عظیم بھی اصلاً وابتداءً برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ہوئی تھی، جرمن اور انگریز دونوں نہ صرف یہ کہ کرسچین ہیں، بلکہ پروٹسٹنٹ بھی ہیں، اوران کا عائلی قانون ومعاشرت تقریباً ایک ہے، پھر یہ دونوں دشمنوں کی طرح کیوں لڑے؟ اگر یونیفارم سول کوڈ جنگ کوروک سکتا ہے اور نبرد آزمائی اور تصادم سے باز رکھ سکتا ہے، تو اس کو وہاں روکنا چاہئے تھا، پھر دوسری جنگ عظیم کا بھی یہی حال تھا کہ وہ دونوں ملک اس طرح سے لڑے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، آپ عدالتوں میں بھی جا کر دیکھ آیئے کہ مسلمان مدعی ہے، اور مسلمان ہی مدعی علیہ ہے، مسلمان مسلمان کی عزت کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے، اس کے گھر پر ہل چلا دینا چاہتا ہے، ان دونوں کا عائلی قانون بھی ایک ہے، بعض اوقات تو خون بھی ایک ہوتا ہے، دونوں فریق ایک نسل ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، یہی حال ہندو فرقہ کا بھی ہے، کہ اس میں بھی عائلی قانون (Personal Law) کی یکسانی اور اشتراک کے باوجود مقدمہ بازی، خانہ جنگی، اور ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا، درحقیقت اختلافات اور دشمنیوں کا تعلق نفسانیت اور دولت پرستی کے جنون سے اور حد سے بڑھی ہوئی مادیت سے ہے، اس غلط نظام اور نصاب تعلیم سے ہے، جس نے اخلاقیات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے، اس کا تعلق ہرگز عائلی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے، میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ عائلی قانون ایک ہو جانے سے اخلاقی صورت حال میں قطعاً ایک ذرہ کا فرق بھی نہیں پڑے گا، پھر کیوں بار بار اس کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ ہونا چاہئے، تا کہ آپس میں اتحاد والفت پیدا ہو؟ طوطے کی طرح اس بات کو دہراتے سطحیت (Loose Thinking) مرعوبیت اور اندھی تقلید کی ایک افسوسناک مثال ہے۔

ان دو محرکات کے ساتھ (معذرت کے ساتھ) یہ بھی اضافہ کرنا پڑتا ہے کہ بعض فرقوں کے عائلی قوانین میں ایسی ناہمواریاں اور نقائص پائے جاتے ہیں، (اور ایسا مخلص سے مخلص اور لائق سے لائق! انسان قانون سازوں کے بنائے ہوئے قوانین میں بھی ہونا

ضروری ہے) کہ ان کی اصلاح اور جدید حالات کے مطابق نئے قوانین کا وضع کرنا ایک رفاہی جمہوری (Welfare Democratic) حکومت کا بھی فرض ہے، اور اس فرقہ کے فرض شناس اور حقیقت پسند رہنماؤں اور نمائندوں کا بھی، اس لئے ہمیں اس معاملہ میں (جہاں تک ان قوموں کا تعلق ہے) نہ ملامت کا حق ہے، نہ احتجاج کا۔

لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، صورت حال اس سے قطعاً مختلف ہے، ان کے ایمان وعقیدہ کا جزء ہے کہ ان کا عائلی قانون (Family Law) اسی خدا کا بنایا ہوا، جس نے قرآن اتارا اور عقائد وعبادات کا قانون عطا کیا، سارا قرآن مجید ان تصریحات سے بھرا ہوا ہے مسلمان اس عقیدہ پر ایمان لانے پر مجبور ہیں، اور اس کے بغیر وہ مسلمان نہیں رہ سکتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون خدائے علیم وخبیر کا بنایا ہوا ہے، جو انسان کا بھی خالق ہے، اور اس کائنات کا بھی، اس کی فطری ضرورتوں اور کمزوریوں دونوں سے واقف ہے، وہ فرماتا ہے:۔

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ. (سورة الملك- ١٤)

کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی) باریک بیں اور (پورا) باخبر ہے۔

اسی طرح وہ زمانہ کا بھی خالق ہے، ہمارے لحاظ سے ماضی حال و مستقبل کی تقسیم کتنی ہی صحیح اور ضروری ہو، اس کے لحاظ سے سب ماضی ہی ماضی ہے، اس لئے ایک بار یہ مان لینے کے بعد کہ وہ خدا کا بنایا ہوا قانون ہے، جو ایک زندہ جاوید امت اور ایک عالمگیر اور دائمی شریعت کے لئے بنایا گیا ہے، تو ترمیم اور تبدیلی کی ضرورت کا مطالبہ ایک کھلے منطقی تضاد (اور جہاں تک مسلمان کہلانے والے اشخاص کا تعلق ہے) ایک اعتقادی وعملی نفاق کے سوا کچھ نہیں، پھر معاملہ صرف ایمان بالغیب اور مذہبی عقیدت اور عصبیت کا نہیں، اس قانون کے مکمل متوازن اور عادل ہونے اور زمان ومکان کی تبدیلی پر حاوی ہونے کے عقلی وعلمی شواہد، اور مسلم وغیر مسلم، مشرقی ومغربی فضلا، جری وانصاف پسند مقننین کے واضح

اعترافات اور عملی تجربے اتنے ہیں کہ کوئی ''شپرہ چشم'' ہی ان سے انکار کرسکتا ہے، اس موضوع پر متعدد نامور فضلاء نے قلم اٹھایا ہے، اور بڑا قیمتی مواد جمع کردیا ہے۔

ہندوستان میں جب یہ مسئلہ اٹھا اور دیکھنے والوں کو یہ نظر آیا کہ افق پر خطرہ کی علامتیں نمایاں ہوگیں ہیں اور یہ بادل جو ابھی کسی کسی وقت گرجتا ہے، کسی وقت ضرور برسے گا، تو انہوں نے ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے نام سے دسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں ایک متحدہ پلیٹ فارم بنایا جس سے وقتاً فوقتاً قانون سازی کی نوعیت اور اس کے رخ کا جائزہ لیا جاتا رہے، اور مسلمانوں کی رائے عامہ کو بیدار رکھنے کا سامان کیا جاتا رہے، تاکہ اچانک ان پر یہ، یا کوئی دوسرا مسئلہ شبخون نہ مارنے پائے، یہ ایک ایسا نمائندہ بورڈ تھا، جس کی مثال اپنی وسعت اور عمومیت اور مختلف مکاتب خیال کی نمائندگی کے لحاظ سے تحریک خلافت کے بعد نہیں ملتی، ۱۹۴۷ء کے بعد اتنے بڑے اجتماعات دیکھنے میں نہیں آئے، اس بورڈ کی تشکیل اور اس کے ان شاندار اور بے نظیر جلسوں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ حکومت اور مسلم پرسنل لا میں اصلاح وترمیم کی آواز بلند کرنے والے حضرات کو ہوا کا رخ معلوم ہوگیا، اور اتنا ثابت ہوگیا کہ مسلمان اس مسئلہ پر صد فی صد متفق ہیں، اس لئے دانشمندی، حقیقت پسندی، اور انتخابی سیاست کا بھی تقاضہ ہے کہ اس مسئلہ کو اٹھانے میں احتیاط کی جائے۔

یہ صورت حال قائم تھی، اور مسلمان اقلیت اور اس معاشرہ وماحول کے دریا کی سطح ساکن تھی، کہ ۲۳ر اپریل ۱۹۸۵ء کو سپریم کورٹ نے شاہ بانو کیس میں نفقہ مطلقہ کے بارے میں وہ ہنگامہ خیز فیصلہ دیا جس سے ملت اسلامی مسلم معاشرہ اور علماء دانشوروں اور مسلم ماہرین قانون کے حلقہ میں ایک ایسا تلاطم اور طوفانی کیفیت پیدا ہوئی، جس کی نظیر اپنی وسعت وعمومیت، شدت احساس بلکہ اذیت وکرب کے لحاظ سے عظیم فرقہ وارانہ فسادات، خوں ریزی وانسان سوزی کے لرزہ خیز واقعات کی موجودگی میں بھی نہیں ملتی، اس لئے کہ یہ مسلمانوں کے تہذیبی، معاشرتی ارتداد، شریعت اسلامی سے بغاوت اور اس کے

برکات سے محرومی کا س پیش خیمہ اور:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ. (سورة المائده-٤٤) جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

کی وعید کا مصداق بنانے والا فتنہ تھا اور اس سے غیر مسلم جج صاحبان یا قرآن وحدیث وتفسیر، فقہ، اصول فقہ اور عربی زبان میں مہارت خصوصی نہ رکھنے والے مسلمان ججوں کے لئے قرآنی آیات، اس کے الفاظ واصطلاحات کی دوسری زبانوں کے ترجمہ کی مدد، سکنڈ ہینڈ معلومات، سطحی اور عاجلانہ مطالعہ اور بعض اوقات، ترقی، پسندی، یا بیرونی اثرات ومؤثرات سے تأثر کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے، من مانی تفسیر اور خواہشمندانہ تشریح (Wishful Thinking) کا آزادانہ موقعہ مل سکتا ہے، اور یہ نہ صرف دین وشریعت، مذہبی صحیفوں بلکہ دنیا کے دائمی عالمگیر اصول، اختصاص (Specialisation) اور علوم وفنون میں اتھارٹی (Authority) کے تسلیم واحترام کے اس اصول کے خلاف تھا جو ساری علمی، فنی دنیا میں صدیوں سے تسلیم کیا جارہا ہے اور جس پر زبان وادب، فلسفہ، منطق، سائنس وٹکنالوجی، اجتماعیات ومدنیات کا نظام چل رہا ہے۔

اس موقعہ پر ہندوستان کی ملت اسلامیہ نے اپنے دین وشریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری اور ملّی غیرت وخودداری کا ایسا ثبوت دیا، جس کی نظیر عرصۂ دراز سے ملی ودینی تحریکات کی تاریخ میں دیکھنے میں نہیں آئی، ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عظیم الشان جلسے ہوئے جن میں بعض اضلاع اور چھوٹے مقامات میں ایک ایک لاکھ سے زیادہ کا مجمع تھا، کلکتہ کے جلسۂ عام جو ۷/اپریل ۱۹۸۵ء کو شہید مینار میدان میں منعقد ہوا تھا محتاط اندازہ کے مطابق پانچ لاکھ (نصف ملین) انسان تھے، شمالی ہند سے جنوبی ہند کے آخری سرے، کشمیر کی فلک بوس چوٹی سے جنوب میں کنیا کماری تک جلسوں کا ایک طوفان امنڈ پڑا، جس میں بورڈ کے ذمہ دار ترین ارکان اور ملک کے ممتاز ترین علماء بذات خود شریک تھے، اس کے علاوہ وزیر ہند مسٹر راجیو جی اور وزیر قانون کے نام ہزاروں کی

تعداد میں احتجاجی تار اور جلسوں کی تجویزیں بھیجی گئیں۔

اس کے بالمقابل انگریزی وہندی پریس نے اس مسئلہ پر ایسی مخالفانہ صف آرائی (Opposed Tooth And Nail) کا مظاہرہ کیا جس کی مثال شاید تقسیم ہنداور جداگانہ قومیت کے مسئلہ پر بھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی، پریس اور فرقہ پرست جماعتوں کی قیادت نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کی اس شدت احساس، اس فیصلہ کو تبدیل کرانے کی کوشش اور ایک جزوی عائلی مسئلہ میں اسلام کے قانون شرعی پر عمل کرنے کی اجازت کو بحال رکھنے کے مطالبہ کو جس سے ایک فرقہ (مسلمانوں) کے ایک محدود طبقہ (خواتین) کی ایک چھوٹی سی تعداد (مطلقہ خواتین) متاثر ہوتی تھی کو اس نظر سے دیکھا گویا اس ملک پر کوئی غیر ملکی طاقت حملہ کرنے والی ہے، یا کوئی ہیبت ناک کوہ آتش فشاں پھٹنے والا ہے، یا کوئی ملک گیر مہلک وبا پھیلنے والی ہے، جیسا کہ میں نے اپنے دہلی کے ڈائلاگ (Dialogue) اور پریس کانفرنس میں کہا ہے''انہوں نے اس بارے میں اصول''احساس تناسب''(Sense of proportion) کو بھی بالائے طاق رکھ دیا''۔

اس ملک گیر عوامی احتجاج اور عظیم الشان جلسوں کے ساتھ (جس میں نظم واحترام، قانون اور سنجیدگی، وقار کا پورا لحاظ رکھا گیا) بورڈ کے ذمہ داروں نے وزیر اعظم ہند راجیو جی سے اور ان کے اشارہ وہدایت سے جمہوریہ ہند کے وزیر قانون مسٹر اشوک سین اور ان کے رفقاء سے رابطہ قائم رکھا، انہوں نے راجیو جی سے دو تین مرتبہ شخصی اور خصوصی ملاقاتیں کیں، اور آزادانہ وبے تکلفانہ فضا میں ان کو اس مسئلہ کو نوعیت واہمیت، مذہبی وشرعی نقطۂ نظر، اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے جذبات وتاثرات سے واقف کرانے کی مخلصانہ کوشش کی، راجیو جی نے بھی (جن کو یقیناً اس سلسلہ میں مسلمانوں کے اضطراب وبے چینی اور عظیم الشان جلسوں کی رپورٹ پہونچ چکی ہوگی) صبر وسکون اور احترام کے ساتھ یہ باتیں سنیں اور وہ اس بارے میں مطمئن (Convinced) ہوگئے

کہ یہ مسلمانوں کا خالص مذہبی مسئلہ ہے، اور اس کی صحیح ترجمانی وہی علماء کر سکتے ہیں، جن کا دین کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہے، اور وہ مسلمانوں کے نزدیک دین وشریعت کے صحیح ترجمان ہیں، اور اس سے کوئی سیاسی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے، چنانچہ انہوں نے ایک سے زائد بار اس کا اظہار کیا کہ انہوں نے اس مسئلہ پر نامور علماء سے تبادلۂ خیال کرلیا ہے، اور وہ مطمئن ہیں کہ اسلام طبقۂ اناث (Female sex) بشمول مطلقہ خواتین کے حقوق کا پورا تحفظ کرتا ہے، اس سلسلہ میں یہاں تک ان کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ وہ موجودہ قانون سے بھی زیادہ ان کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے، اور ان کو حق دیتا ہے، وہ حقیقت پسندی، اخلاقی جرئت، اور احساس ذمہ داری، اور عزم وفیصلہ کے ساتھ مطلقہ خواتین کے حقوق کے تحفظ کا بل پارلمینٹ میں لائے اور اس پر واضح اور طاقتور وہپ (Whip) جاری کیا، اور وہ ۶ رمئی ۱۹۸۶ء کو "تحفظ حقوق مسلم مطلقہ بل" کے عنوان سے کھلی اکثریت کے ساتھ پاس ہوا، اور مسلمانوں نے ایک ایسی ملت کی طرح (جو صحیح وغلط تائید ومخالفت اور خلوص وسیاست میں فرق کرنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوئی) اس شریفانہ اور جرأت مندانہ اقدام کا پوری فراخ دلی اور جذبۂ شرافت کے ساتھ اعتراف اور اپنے تشکر وامتنان کا اظہار کیا، اور وزیر اعظم صاحب کے نام ملک کے کونہ کونہ سے شکریئے کے اتار آئے، بیرونی ملک کے بھی بعض موقر تنظیموں اور علمی مجلسوں نے شکریہ وتحسین کے تار بھیجے، سعودی عرب، کویت، امارات، اور برطانیہ کے عربی اخبارات ورسائل نے پہلی پر تبہ اس پر مسرت کا اظہار اور حکومت ہند کی حقیقت پسندی کا اعتراف کیا۔

یہ واقعات کی منطق (Logic) اور حقیقت پسندی کا دانشمندانہ تقاضا تھا، اور موقعہ پر ایک مشہور برطانوی ماہر قانون بوڈن ہمیر (E.Boden Heimer) نے "فلسفۂ قانون اور اس کی سماجی اہمیت" سے بحث کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، وہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:۔

"کسی قانونی نظام سے جس کا منشا زندگی میں یکسانیت پیدا کرنا ہو

لوگوں کے ایک بڑے طبقہ میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہو کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے، تو اس قانون کو ٹوٹنے یا اس سے بچنے سے محفوظ رکھنا حکومت کے ذمہ داروں کے لئے انتہائی مشکل ہوگا، لوگ کسی ایسے قانون کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکتے جسے وہ نامناسب یا ناقابل برداشت سمجھتے ہوں، جو حکومت اس قسم کے نظام قانون کو برقرار رکھنے پر مصر ہو اسے اس کو نافذ کرنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، اس لیے کوئی نظام جس کی بنیاد انصاف پر نہ ہو غیر محفوظ اور پرخطر ہوگا، جیسا کہ جان ڈکنسن (John. Dickenson) نے کہا ہے، ہمیں کسی عام اور متعین ضابطہ کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایسے ضابطہ کی جس کی بنیاد انسانی ضرورت اور صلاحیت پر ہو، ورنہ وہ نظام قابل عمل نہ ہوگا، یہ قانون منصفانہ اقدار، اندرونی رجحان کی خلاف ورزی کرے گا، ہمیشہ اس کی خلاف ورزی کی جائے گی، اور اتنا ناپائیدار ہوگا کہ اس کا جواز ہی ختم ہو جائے گا''۔(۱)

اس موقعہ پر اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جہاں تک اس مسئلہ میں اتحاد رائے اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ سے تعاون کرنے کا تعلق ہے، ملک کی تمام مسلم سیاسی وغیر سیاسی جماعتوں وتنظیموں اور مذہبی مکاتب خیال نے اس سے پورا اشتراک عمل اور تعاون کیا، اور ان کے قائدین نے اس مشترک ملّی مسئلہ سے پوری دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا، اور ملک گیر دوروں میں شریک رہے۔

اس سلسلہ میں ناسپاسی ہوگی اگر ہم ان خاص شخصیتوں کا نام نہ لیں، جنھوں نے پارلیمنٹ کے اندر اور پارلیمنٹ سے باہر پوری طاقت اور لیاقت کے ساتھ مسئلہ کی وکالت اور مسلمانوں کے جذبات کی نمائندگی کی، ان میں ارکانِ حکومت میں سے جناب ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب اور ممبران پارلیمنٹ میں سے جناب محمود بنات والا صاحب خاص

E. Bodenheimer, Jurisprudence, Harvard, 1967, P. 212(۱)

طور پر ملت کے شکریہ کے مستحق ہیں، خواتین میں سے محترمہ نجمہ ہبۃ اللہ صاحبہ اور بیگم فخر الدین علی احمد صاحبہ اور بعض دوسری اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین نے اپنی دینی حمیت اور اسلامی مسائل سے دلچسپی کا ثبوت دیا، اور اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ صرف مردوں کا طبقہ ہی اس جدوجہد میں شریک اور اسلام کے عائلی قانون سے مطمئن نہیں، بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین بھی اسلامی قوانین سے مسرور و مطمئن اور اس کی برتری و بہتری کی قائل ہیں۔

حضرات!

یہ دین جو ہم تک پہونچا ہے، اور جس دولت کے ہم آپ امین اور (محافظ کا لفظ تو بڑا ہے) اس دولت کے حامل ہیں، وہ دین ہمیں دانشوروں، سماجی خدمت گاروں، اصلاحی کام کرنے والوں (Reformers) یا بانیان سلطنت کے ذریعہ نہیں پہونچا، یہ سارے گروہ قابل احترام ہیں، لیکن کسی دین میں اور کسی تہذیب، نظام فکر، دبستان (School of Thought) اور خاص مطالعہ، غور وفکر اور تجربہ کے نتائج میں ایک حدِ فاصل، سرحدی لکیر (Line of Demarcation) ہوتی ہے، جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے، اس خط کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، حدّ فاصل یہ ہے کہ آسمانی مذاہب (ادیان) ان برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہونچے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا، اور جن پر وحی آتی تھی، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے خلط مبحث (Confusion) ہوتا ہے، زیادہ تر لوگ نادانستہ طریقہ پر ان مذاہب سے توقع اور بعض اوقات آگے بڑھ کر ایسی چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں، جن کی ان مذاہب میں گنجائش اور ان کا کوئی جواز نہیں، وہ بعض اوقات ان کی تشریح کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے ہیں، اپنی وسعت مطالعہ اور وسعت نظر کے اظہار کے لیے وہ مذاہب کی ترجمانی ایسی کرنے لگتے ہیں جیسے کہ یہ نرے فلسفے یا انسانوں کے بنائے ہوئے تہذیب وتمدن کے نظام اور سماجی تجربے اور معاشرتی نظریات ہیں، یہ ہے وہ غلطی جو نادانستہ طریقہ پر بعض بڑے ذمہ دار اور سنجیدہ

لوگوں سے ہوتی ہے، وہ یہ نہیں جانتے کہ دین اور غیر دین میں حدّ فاصل اور امتیازی نشان کیا ہے؟ فلسفہ، سماجیات (Social Sciences) کا علم تہذیب وتمدن (Civilization) سوسائٹی اور انسانی معاشرہ یہ سب اپنی جگہ حقائق ہیں، ہم ان کا انکار نہیں کرتے، ان کا احترام کرتے ہیں، اور اپنے ذمہ ان کے حقوق سمجھتے ہیں، خود مسلم ملت ایک معاشرہ، تہذیب وتمدن اور فکرودانش کا ایک مستقل مدرسہ (School of Thought) بھی ہے، لیکن اس کی جو اصل حقیقت ہے، وہ یہ ہے کہ وہ ایک ''دین'' ہے اور اس دین کو دنیا میں پیش کرنے والے، اور اس کو بروئے کار لانے والے، اس کو ہماری زندگی میں داخل کرنے والے انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام ہیں، اور یہ ان کی زبان اور ان کا طرز فکر نہیں، اس کا بنیادی چشمہ ان کے دماغ میں نہیں تھا، بلکہ ان سے باہر اور ان سے بلند تھا، اور وہ ان کے لیے اسی درجہ قابل احترام اور قابل اطاعت تھا، جیسے ہمارے آپ کے لیے اور سارے امتیوں کے لیے۔

''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى''. (سورة النجم: ٣، ٤)

اور وہ خواہش نفس سے منھ سے بات نہیں نکالتے ہیں، یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے (اور ان کی طرف بھیجا جاتا ہے)۔

''وَمَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَاط وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ''. (سورة الشورىٰ: ٥٢)

آپ نہیں جانتے تھے کہ لکھنا پڑھنا کیا ہوتا ہے، ہم نے اس کو ایک نور کی طرح آپ کے سینہ میں اتارا اور اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں، ہدایت کرتے ہیں، اور بے شک (اے محمدؐ) تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو۔

وحی ونبوت کا فرق اساسی فرق ہے، ہمیں غیر مسلم بھائیوں اور غیر مسلم فضلاء سے زیادہ شکوہ نہیں کہ وہ وحی ونبوت کے عہد سے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ ان کے مفہوم سے بھی بہت سے حضرات نا آشنا ہیں، بعثت محمدی سے پہلے خود عربوں کا یہی حال تھا، اس میں نہ کسی

ذہانت کا انکار ہے، اور نہ کسی کی نیت پر حملہ ہے، ایک تاریخی یا نفسیاتی تجزیہ ہے کہ جو شخص نبوت اور وحی کی حقیقت سے واقف نہیں، اور یہ نہیں جانتا کہ اس کا کیا مرتبہ اور حق ہے اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ کس چیز کی متقاضی ہے، وہ مسلمانوں کے بارے میں مشورہ دینے یا فیصلہ کرنے کا اخلاقی یا قانونی طور پر مجاز نہیں۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ دین اسلام کے دائرہ کو سمجھ لیا جائے، اس بارے میں مذاہب میں خود اختلاف ہے، اور اس میں درجوں کا فرق ہے، کئی مذاہب ایسے ہیں کہ وحی و نبوت سے ان کا آغاز ہونے کے باوجود انھوں نے مذہبی زندگی کو ایک خاص دائرہ میں محدود کر لیا ہے، مثلاً عبادات کے دائرہ میں، لیکن اسلام کا معاملہ یہ نہیں ہے، اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے، یہ ایک اساسی حقیقت ہے جو عبد و معبود کے تعلق کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی، ہر مسلمان خدا کا فرماں بردار بندہ ہے اور اس کا تعلق خدا سے دائمی ہے، عمومی ہے، عمیق بھی ہے، اور وسیع بھی ہے، محدود بھی ہے، جامع بھی، قرآن شریف میں ہے:۔

"يَاۤأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ص وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ط اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ". (سورة البقرہ:۲۰۸)

اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔

میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان اگر مسلم پرسنل لا (شرعی، عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کر لیں گے، تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے، اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ نفسیات، اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت و تہذیب سے الگ نہیں کیا جا سکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی، اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر و محفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں، (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے، اپنے سارے شوق عبادت کے

باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اپنے عائلی وخاندانی روابط وتعلقات میں مسلمان نہیں، حقوق کی ادائیگی اور ترکہ کی تقسیم میں مسلمان نہیں، اس لیے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت، نظام تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اس کو دعوتِ ارتداد سمجھتے ہیں، اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے، جیسے دعوت ارتداد کا مقابلہ کرنا چاہئے، اور یہ ہمارا شہری، جمہوری اور دینی حق ہے، اور ہندوستان کا دستور اور جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقا اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون واطمینان میں مضمر ہے۔

حضرات!

میں اجازت چاہتا ہوں کہ چند دن پیشتر (۲۲ر نومبر ۱۹۸۶ء) کو وارانسی کی صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس میں میں نے جو خطبہ پڑھا تھا، اس کا ایک اقتباس آپ کے سامنے پیش کروں کہ وہ اس مسئلہ (مسلم پرسنل لا) سے بھی وہی تعلق رکھتا ہے، جو مسلمانوں کی نئی نسل کی دینی تعلیم کے مسئلہ سے، میں نے عرض کیا تھا کہ:۔

''آپ ایسے ملک میں ہیں جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، وہ جمہوری ملک ہے، اور وہاں قانون ساز مجلسیں قانون بناتی ہیں، جب یہ ملک جمہوری ہے تو پارلیمنٹ ہی قانون بنائے گی، اور جمہوریت کا یہ قاعدہ ہے کہ اکثریت کی رائے اور تائید سے قانون بنتا ہے، اس لیے ہر وقت اس کا خطرہ ہے کہ ایسے قوانین بنیں جو ہمارے بنیادی عقائد، مسلّمات، ہمارے جذبات اور ہماری ضرورتوں کے خلاف (بدنیتی سے کم اور ناواقفیت سے زیادہ) بنیں، یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ وہاں مذہبی، تہذیبی، اور لسانی بنیادوں پر جارحانہ احیائیت (Aggressive Revivalism) اور کلّیت پسندی (Totalitarianism) کی تحریکیں بھی زور شور سے چل رہی ہیں، اب آپ کا کام یہ ہے کہ ایسے سیکولر اور جمہوری ملک میں اپنے ملّی تشخص کی حفاظت آئینی طریقہ پر

کریں، آپ ہندوستان کے وفادار، مفید، کارآمد اور اس کے ضروری جز و ہونے کی حیثیت سے اپنی افادیت و اہمیت ثابت کریں، اور مطالبہ کریں کہ کوئی قانون ہماری شریعت، آسمانی کتاب، اور ہمارے عقائد کے خلاف نہیں بننا چاہئے، آپ اسی کے ساتھ یہ بھی ثابت کریں کہ خلاف شریعت قانون بننے سے آپ کو اس سے زیادہ اذیت ہوتی ہے، اور آپ کا ملّی وجود اس سے زیادہ خطرہ میں پڑ جاتا ہے، جتنا کھانا روکنے سے، کوئی جمہوری حکومت، کسی اقلیت اور کسی فرقہ کی غذائی ضرورتوں کو نہیں روک سکتی، کوئی حکومت چاہے کتنی ہی طاقتور ہو، یہ قانون نہیں بنا سکتی کہ فلاں فرقہ کو غلہ کی فراہمی روک دی جائے، یا بازار میں اس کو دکان کھولنے کی اجازت نہ دی جائے، یا اس کے بچوں پر تعلیم اور تعلیم گاہوں کے دروازے بند کردیئے جائیں، ایسا اگر ہونے لگے تو آپ قیامت برپا کرسکتے ہیں، آپ ثابت کردیں کہ اس قانون اور اس نئے نظام تعلیم سے آپ کو ایسی گھٹن ہورہی ہے، جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر باہر رکھنے سے ہوتی ہے، آپ کے چہروں کے اتار چڑھاؤ، حرکات وسکنات سے معلوم ہوجائے کہ آپ کی صحت اور توانائی اور کارکردگی پر اثر پڑ رہا ہے، اور یہ محسوس کرلیا جائے کہ یہ ایک مغموم قوم کے افراد ہیں، اس نئے قانون سے ان کا دم گھٹ رہا ہے، اور یہ ان کی آئندہ نسل کے قتل کے مرادف ہے، یہ کام آپ کو خلوص کے ساتھ عملی طور پر ایسی کیفیات کے ساتھ کرنا ہوگا کہ ہر شخص اسٹیشنوں، پارکوں، اور بسوں میں آپ کی بے چینی کو محسوس کرے، اگر آدھا نہیں تو کم از کم اس کا چوتھائی حصہ ثابت کرنا ہوگا، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک ہفتہ بھی ایسا قانون نہیں چل سکتا، میں نے دنیا کے آئینوں اور دستور حکومت کا مطالعہ کیا ہے، اور جمہوریتوں کی تاریخ پڑھی ہے، اس لیے میں یہ بات کہہ رہا ہوں“۔

برادران ملت!

اب میں اس مجمع کو ایمانی وقرآنی زبان میں خطاب کرنا چاہتا ہوں، اور آپ کی عملی زندگی کا محاسبہ کرتا ہوں، آپ دیکھئے کہ آپ اسلامی وقرآنی قانون معاشرت کا خود کتنا احترام کرتے ہیں، اس پر خاندانی روایات کو اور رسم و رواج کو کتنی ترجیح دیتے ہیں؟ اس پر اس کا

اضافہ کیجئے جو آپ نے اپنے ہم وطنوں سے سیکھا ہے، جہیز کا بڑھا چڑھا مطالبہ ہم میں کہاں سے آیا؟ اس کو کسی نام سے یاد کیا جاتا ہو، یہ چیز کہاں سے آئی؟ مکہ، مدینہ، حرمین شریفین سے آئی ہے؟ قرآن مجید کے راستہ سے آئی، یہ لعنت کہاں سے آئی؟ جب آپ اس کو قبول کرتے ہیں تو بطور سزا کے آپ کی غیرت ملیؔ کو، آپ کے وجود ملیؔ کو بار بار نشانہ بنایا جاتا ہے۔

میں بہانگ دہل اعلان کرتا ہوں کہ ہم لوگ (شرعی قانون میں قانون سازی کے ذریعہ مداخلت کی) جو شکایت کرتے ہیں، وہ شکایت بجا ہے، ہم شکایت کرتے رہیں گے اور شکایت کرنا ہمارا حق ہے، ایک جمہوری ملک میں جہاں قانون چلتا ہو، جہاں ہر شہری کو برابر کا حق دیا گیا ہو، وہاں ہر شہری کو اور شہریوں کی ہر تنظیم کو اور آبادی کے ہر عنصر کے نمائندوں کو یہ حق ہے کہ پارلیمنٹ (ایوان قانون ساز) میں اپنے قومی و عوامی جلسوں میں، اپنی مجلسوں میں اور اخباروں کے کالموں میں، وہ اس بات کی شکایت کریں کہ ہمارا فلاں حق نہیں مل رہا ہے، ہمارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، کوئی ملک جس کی جمہوریت پر بنیاد ہو، جو جمہوری ہو، اس کے بغیر نہیں چل سکتا، حقیقت پسند حکومتیں اس بات کا اہتمام کرتی ہیں کہ ان کے ایوان قانون ساز میں ایک حزب مخالف رہے، ایک اپوزیشن پارٹی ہو، تا کہ اس کے ذریعہ حکومت کو اپنی خامیاں معلوم ہوتی رہیں، اور اس کو ملک کی آبادی کو زیادہ مطمئن کرنے اور مطمئن رکھنے کا موقعہ ملتا رہے، اس لیے ہم اپنی حکومت سے شکایت کریں گے اور سو بار کریں گے، اور اس کو اس پر فخر کرنا چاہئے کہ ہمارے ملک میں شکایت کرنے کا حق ہے، یہ حق سلب نہیں کیا گیا ہے، ہمیں اپنی آواز بلند کرنے کا حق ہے، ہم اسی میں ملک کی فلاح سمجھتے ہیں، وہ ملک خطرہ میں ہے، جہاں زبان بندی کا قانون نافذ کیا جائے، جہاں کسی کو کراہنے اور آہ کرنے کی اجازت نہ ہو، اس لیے ہمارے اس ملک کا یہ افتخار، ہمارے اس ملک کی یہ خصوصیت باقی رہنی چاہئے، ہم ہمیشہ اپنے آئین ساز بھائیوں سے اور ارکان حکومت سے انتظامیہ (Administration) اور حکمراں جماعت سے شکایت کریں گے۔

لیکن جب ہم اہل حکومت اور برادران وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ

سے شکایت کرنے کا حق کیوں نہ ہو؟ ان سے تو شکایت کریں گے اوران کا دامن پکڑیں گے، لیکن آپ کا گریبان پکڑلیں گے، اوروہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہوگا، وہ دینی احتساب کا ہاتھ ہوگا، وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا جو آپ کا گریبان پکڑے گا، اور کہے گا کہ پہلے تم اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھو کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو، تمہاری نگاہوں میں اس قانون کی کتنی حرمت ہے؟ تم جہاں اس قانون کو چلا سکتے ہو وہاں چلا رہے ہو کہ نہیں؟ تم تو اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے قانون کو چلائے، اس کا احترام کرے؟

یہاں سے یہ عہد کر کے جایئے کہ اب قانون شریعت پر آپ چلیں گے، یہ جہیز کی کیا مصیبت ہے؟ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کئے جاتے ہیں، ان کے پورا نہ ہونے پر یہ معصوم لڑکیاں جلادی جاتی ہیں، ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں، صرف دہلی میں ہر بارہ گھنٹے پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے(۱)، کیا اس کائنات کے خالق اور نوع انسانی کے مربی (جس کی مخلوق مرد وعورت دونوں ہیں) کو یہ چیز گوارہ ہوسکتی ہے؟ کیا اس ظلم کے ساتھ کوئی ملک، کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے، خدا کی رحمت ونصرت کا مستحق ہوسکتا ہے؟ آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی ہمت نہیں ہونی چاہئے تھی، میں نے دہلی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

"وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ط وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ". (سورۃ الانفال:۳۳)

اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے، انھیں عذاب دیتا، اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور انھیں عذاب دے۔

آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہندوستانی سماج

---

(۱) قومی آواز دہلی، ۱۰/جون ۱۹۸۳ء

میں، ہندوستان کے معاشرہ اورسوسائٹی میں یہ ظلم ہو، اس کوعقل قبول کرنے کے لیے تیارنہیں، آپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں ہونا چاہیے تھا، چہ جائیکہ آپ کے ہاتھوں ہو، عہد کیجئے کہ آپ اسلامی طریقہ پر شریفانہ انسانی طریقہ پر شادی کا پیام دیں گے، آپ لڑکی مانگیں گے، اپنے لیے رفیقۂ حیات کی تلاش کریں گے، بیٹے کے لیے پیام دیں گے، جہیز کے لیے آپ کے بڑے چڑھے مطالبات نہیں ہوں گے، کہ ہمیں یہ ملنا چاہیے، وہ ملنا چاہیے، لڑکوں کواوران کے وارثوں اور بزرگوں کواس کا عہد کرنا چاہیئے کہ ہم اپنے یہاں تو کیا ہم اس ملک سے اس رسم کوختم کردیں گے۔

ایسا ہی ترکہ شرعی طریقہ پر تقسیم ہونا چاہیئے، نکاح شرعی طریقہ پر ہونا چاہیے، اورعورتوں کی، بیویوں کی تعداد وہی ہونی چاہیئے، جوشریعت میں بیان کی گئی ہے، طلاق کا مسنون طریقہ معلوم کرنا چاہیے، مسنون اورافضل طریقہ کیا ہے؟ پھراس کے بعد فقہی طلاق جس سے طلاق واقع ہوجاتی ہے، اس کوسمجھنا چاہیئے کہ طلاق رجعی کیا ہوتی ہے؟ طلاق بائن ومغلظہ کیا ہوتی ہے؟ پھراس میں طلاق کوآپ یہ سمجھیں کہ طلاق ابغض المباحات ہے، خودرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جائز ہے، لیکن آخری درجہ کی چیز ہے، بڑی مجبوری کی چیز ہے، جواپنے کوحرام چیزوں سے اورزندگی کوتلخ بننے سے بچانے کے لیے بہت مجبوری سے دل پر پتھررکھ کراختیار کی جاتی ہے، یہ نہیں کہ طلاق ایک فیشن ہوگیا ہے، جولوگ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے ہیں، اس میں تھوڑی سی ہماری کوتاہی کوبھی دخل ہے، جتنا طعنہ دیتے ہیں، اتنے کے مستحق توہم ہرگزنہیں ہیں۔(۱)

ہم جانتے ہیں کہ یورپ میں کیا ہوتا ہے؟ وہاں کا معاشرہ کس طرح برباد ہورہا ہے، وہاں ساری عمرنا جائزطریقہ پرجنسی تعلق قائم رکھنا جائز ہے، کوئی اس کونہیں ٹوکتا لیکن طلاق دینا معیوب ہے، اوراس میں ہزاردقتیں ہیں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ہم اپنے قانون سے ہرگزشرمندہ نہیں، ہم اس کے ایک ایک نقطہ کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار

(۱) مسلمانوں میں طلاق کی شرح وہ نہیں ہے جوبیان کی جاتی ہے، اس میں مبالغہ اوررنگ آمیزی سے کام لیا جاتا ہے، پھربھی تھوڑی سی بے اعتدالی ضرور ہے۔

ہیں، ہمارے علماء نے اس پر ایک کتب خانہ تیار کر دیا ہے، اور چند مہینوں سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ امارت شرعیہ بہار واڑیسہ اور اس کے واجب الاحترام امیر کی ذاتی نگرانی میں مستند علماء اور ماہرین فقہ کے ذریعہ جدید زبان واسلوب وترتیب کے ساتھ عائلی قانون اور مسائل نکاح وطلاق وحقوق وفرائض کی تدوین کا کام شروع ہو گیا ہے، اور اس کا خاصا حصہ مرتب ہو کر ممتاز علماء اہل نظر کی خدمت میں رائے ومشورہ کے لیے بھیجا جا چکا ہے، اس کی ترتیب کے بعد عدالتوں اور مجلس قانون ساز اور معترضین کو یہ کہنے کا حق بھی نہیں ہوگا کہ ہمارے پاس قدیم تراجم کے علاوہ جو زیادہ تر غیر مسلم قانون دانوں اور مصنفین کی مرتب کی ہوئی ہیں، شریعت اسلامی کا مستند وبراہ راست کوئی مجموعۂ قوانین نہیں ہے، اسی کے ساتھ اصلاح معاشرہ، اصلاح رسوم اور مسلمانوں کی عائلی زندگی کو شرعی احکام، قرآنی تعلیمات اور اسوۂ نبویؐ کی روشنی میں منظم وبہتر بنانے کی کوشش بھی جاری کر دی گئی ہے، اور جا بجا دارالقضاء بھی قائم کئے جا رہے ہیں، تاکہ مسلمان اپنے تنازعات ومسائل خاص شریعت کی روشنی میں حل کریں، اور امکانی حد تک مقدمات واختلافات کا فیصلہ کرانے میں (خصوصیت کے ساتھ جن کا تعلق احکام شرعی سے ہے) خود کفیل ہو جائیں۔

آخر میں آپ کے اس اعتماد واعزاز کا نیز آپ کی توجہ والتفات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کا آپ نے مجھے اپنے خیالات کے بے لوث وآزاد طریقہ پر پیش کرنے کی اجازت دے کر اظہار فرمایا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین.

ملک میں مذہبی آزادی اور ملّی تشخص کا بقا
حقائق اور اندیشے

خطبۂ صدارت

اجلاس نہم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

منعقدہ ۴/۵/مارچ ۱۹۸۹ء بمقام کانپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وحدہ والصلاۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ!

حضرات!

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے ایمان وعقیدہ کا جزو ہے کہ ان کا عائلی قانون (Personal Law) اسی خدا کا بنایا ہوا ہے جس نے قرآن اتارا اور عقائد وعبادات کا قانون عطا کیا، سارا قرآن مجید ان تصریحات سے بھرا ہوا ہے مسلمان اس عقیدہ پر ایمان لانے پر مجبور ہیں، اور اس کے بغیر مسلمان نہیں رہ سکتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون خدائے علیم وخبیر کا بنایا ہوا ہے، جو انسان کا بھی خالق ہے اور اس کائنات کا بھی، اس کی فطری ضرورتوں اور کمزوریوں دونوں سے واقف ہے، وہ فرماتا ہے:

اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ط وَھُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ

کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی) باریک بیں اور باخبر ہے۔ (سورۃ الملک-۱۴)

اسی طرح وہ زمانہ کا بھی خالق ہے، ہمارے لحاظ سے ماضی، حال، مستقبل کی تقسیم کتنی ہی صحیح اور ضروری ہو، اس کے لحاظ سے سب ماضی ہی ماضی ہے۔

اس لئے ایک بار یہ مان لینے کے بعد کہ وہ خدا کا بنایا ہوا قانون ہے جو ایک زندہ جاوید ملت اور ایک عالمگیر اور دائمی شریعت کے لئے بنایا گیا ہے تو ترمیم اور تبدیلی کی ضرورت کا مطالبہ ایک کھلے منطقی تضاد (LOGICAL CONTRADICTION) (اور جہاں تک مسلمان کہلانے والے اشخاص کا تعلق ہے) ایک اعتقادی وعملی نفاق (HYPOCRISY) کے سوا کچھ نہیں۔

پھر معاملہ صرف ایمان بالغیب اور مذہبی عقیدت اور عصبیت کا نہیں، اس قانون

کے مکمل، متوازن اور عادل ہونے اور زمان ومکان کی تبدیلی پر حاوی ہونے کے بارہ میں عقلی وعملی شواہد، اور مسلم اور غیر مسلم مشرقی ومغربی فضلاء جری وانصاف پسند مقننین کے واضح اعتراضات اور عملی تجربے اتنے ہیں کہ کوئی ''شپرہ چشم'' ہی ان سے انکار کرسکتا ہے، اس موضوع پر متعدد نامور فضلاء نے قلم اٹھایا ہے اور بڑا قیمتی مواد جمع کر دیا ہے۔

متعدد انصاف پسند مغربی فضلاء اور معاشرتی وتمدنی تاریخ کے ماہرین نے ان قرآنی اور شرعی تعلیمات کی برتری کا اعتراف کیا ہے، جو عورتوں کے احترام اور ان کے حقوق وتحفظات پر مشتمل ہیں۔

ہم یہاں دو تین شہادتوں پر اکتفا کرتے ہیں، ان میں سے ایک شہادت ایک مغربی فاضلہ کا ہے، جو ہندوستان میں ایک تربیتی واصلاحی تحریک کی قائد، اور جنوبی ہند کے ایک ثقافتی ادارہ (تھیاسوفیکل سوسائیٹی) کی صدر رہی ہیں، انہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا تھا کسی خاتون کی شہادت اس لئے بھی اہم اور قیمتی ہوتی ہے کہ وہ عورت کے معاملہ میں حساس ہوتی اور اسکی طرف سے دفاع میں دل چسپی رکھتی ہے، مسزاینی بسنٹ (Mrs. Annie Bisant) کہتی ہیں:

''......ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ عورتوں کے متعلق اسلام کے قوانین ابھی حالیہ زمانہ تک انگلینڈ میں اپنائے جارہے تھے، یہ سب سے منصفانہ قانون تھا، جو دنیا میں پایا جاتا تھا، جائیداد، وراثت کے حقوق اور طلاق کے معاملات میں یہ مغرب سے کہیں آگے تھا اور عورتوں کے حقوق کا محافظ تھا، یک زوجگی اور تعدد ازدواج کے الفاظ نے لوگوں کو مسحور کر دیا ہے، اور وہ مغرب میں عورت کی اس ذلت پر نظر نہیں ڈالنا چاہتے جسے اس کے اولین محافظ سڑکوں پر صرف اس کے لئے پھینک دیتے ہیں کہ اس سے انکا دل بھر جاتا ہے، اور پھر ان کی کوئی مدد نہیں کرتا''۔(۱)

مسٹر (N.J.COULSON) لکھتے ہیں:

---

(۱) Annie Besant. The Life & Teachings of Muhammad, (Madras-1932), P.3

''بلاشبہ عورتوں کی حیثیت کے معاملے میں خاص طور پر شادی شدہ عورتوں کے معاملہ میں قرآنی قوانین افضلیت کا مقام رکھتے ہیں، نکاح اور طلاق کے قوانین کثیر تعداد میں ہیں، جن کا عمومی مقصد عورتوں کی حیثیت میں بہتری لانا ہے، اور وہ عربوں کے قوانین میں انقلاب انگریز تبدیلی کے مظہر ہیں،......اسے قانونی شخصیت عطا کی گئی جو اسے پہلے حاصل نہیں تھی، طلاق کے قوانین میں قرآن نے سب سے بڑی تبدیلی جو کی ہے، وہ عدت کو اس میں شامل کرنا ہے۔''(۱)

مذہب واخلاق کی انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

''پیغمبر اسلام نے یقیناً عورت کا درجہ اس سے زیادہ بلند کیا جو اسے قدیم عرب میں حاصل تھا، خصوصی طور پر عورت متوفیٰ شوہر کے ترکہ کا جانور نہیں رہی، بلکہ خود ترکہ پانے کی حقدار ہو گئی، اور ایک آزاد فرد کی طرح اسے دوبارہ شادی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا، طلاق کی حالت میں شوہر پر یہ واجب ہو گیا کہ وہ اسے وہ سب چیزیں دیدے جو اسے شادی کے وقت ملی تھیں۔

اس کے علاوہ اعلیٰ طبقہ کی خواتین علوم اور شاعری سے دل چسپی لینے لگیں، اور کچھ استاد کی حیثیت سے بھی کام کیا، طبقۂ عوام کی عورتیں اپنے گھر کی مالکہ کی حیثیت سے اپنے خاوندوں کی خوشی اور غم میں شریک ہونے لگیں، ماں کی عزت کی جانے لگی۔''(۲)

ہم جانتے ہیں کہ یورپ میں کیا ہوتا ہے؟ وہاں کا معاشرہ انتشار و زوال کے آخری مرحلہ پر پہونچ گیا ہے، عائلی زندگی کی ابتری اور معاشرتی ربط وتعلق کی کمزوری، بے وقعتی اور مذہب واخلاق سے اس کی آزادی اور آخری درجہ کی جنسی بے راہ روی نے پورے

N.J. Coulson, Islamic Surveys : A History of Islamic Law (۱) (Edinburg-1971) P.14

Encyclopedia of Religion and Ethics. (New York 1912) Vol. V. P. 271(۲)

پورے ملک نہیں بلکہ مغربی تہذیب کو اس انجام کے قریب لا کر کھڑا کر دیا ہے، جو قدیم یونانی، رومی، ساسانی تہذیبوں کو پیش آیا اور تاریخ میں صرف ان کا نام رہ گیا، اس انجام سے اس کو اس کی مادی و صنعتی علمی و تحقیقی ترقیاں جو نقطہ عروج پر پہونچ گئی ہیں، اور جنگی اسلحہ و سیاسی طاقت اور دنیا کے اقوام وملل پر حاکمانہ وسرپرستانہ وناصحانہ ومحتسبانہ اثر ونفوذ بھی روک نہیں سکتا کہ جس گھر کا شیرازہ اندر سے درہم برہم ہو چکا ہو، اس کو نہ کوئی جنگی طاقت بچا سکتی ہے، نہ باہر کی مدد۔

بقول اقبالؔ ؎

خود بخود گرنے کو ہے پکّے ہوئے پھل کی طرح
دیکھئے گرتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

وہاں ساری عمر ناجائز طریقہ پر جنسی تعلق قائم رکھنا جائز ہے، کوئی اس کو نہیں ٹوکتا، لیکن طلاق دینا معیوب ہے، اور اس میں ہزاروں دقتیں ہیں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟

مغرب میں عائلی زندگی اور معاشرت کا جو بحران (CRISIS) پایا جاتا ہے، اور اس کا اعصاب واخلاق پر جو اثر ہے، اس کے لئے صرف ایک اقتباس پر اکتفا کی جاتی ہے:

> ''شہری کھانا بدوشوں کی ایک نسل ہے، جو خاندان کے مرکز سے بہت دور جا چکی ہے اور جو اپنے کام میں روحانی سکون کی متلاشی ہے، جس کے ذریعہ اسے حرارت وتقویت حاصل ہوتی ہے لیکن (کام کا) نگراں اگر احمق ثابت ہوا یا مشاہرہ ناکافی ہوا یا ملازمت غیر محفوظ اور غیر منفعت بخش ہوئی تو اسے قلبی طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی فریب میں مبتلا تھا۔ اس کے دل کو ایک گہری چوٹ لگتی ہے۔ یا شائد اس چوٹ سے اسے انکشاف ہوتا ہے کہ اس کے اندر تو پہلے سے ہی خلا موجود تھا۔ اور پھر اس انکشاف کے بعد وہ پستول کا سہارا لیتا ہے یا پھانسی کے پھندے کا، یا پھر نشہ آور گولیوں کا اور صرف یہ نوٹ چھوڑ جاتا ہے کہ ''خاک شدم''۔(۱)

---

(۱) Lance Morrow : The Burnout of Almost Everything In the Time Magazine, Washington, Dated September. 27, 1981

ہم اپنے قانون سے ہرگز شرمندہ نہیں، ہم اس کے ایک ایک نقطہ کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں، ہمارے علماء نے اس پر ایک کتب خانہ تیار کردیا ہے۔

حاضرین کرام! ہندوستان جیسے عظیم ملک میں جو مختلف مذاہب، تہذیبوں، زبانوں اور معاشرتی و عائلی نظاموں کا صدیوں سے مرکز چلا آرہا ہے، اور جس نے اپنی طویل تاریخ کے تسلسل میں مذہبی آزادی اور ملّی تشخص کے نہ صرف جواز و امکان کا اعتراف بلکہ احترام کیا ہے، اس خصوصیت کی نہ صرف باقی رہنے کی اجازت دی گئی ہے، بلکہ اس کی حفاظت و بقا اور ترقی کو بھی پسند کیا گیا ہے، اور اس کو ملک کی عزت وعظمت اور نیک نامی وشہرت کا ذریعہ سمجھا گیا ہے، اور اسی کے لئے نامذہبی (SECULAR) اور جمہوری طرزِ حکومت (بشرطیکہ و پوری غیر جانبداری اور ذہن وضمیر کی صفائی کے ساتھ ہو) کو سب سے زیادہ سہل العمل، بے خطر اور قابل قبول نظام سمجھ کر قبول کیا گیا ہے، اور یہ حقیقت پسندی، سچی حب الوطنی، اقوام وملل، تمدنوں، تہذیبوں اور علوم وفنون اور فلسفہ کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔

اس حقیقت پسندی اور صحیح جمہوریت کے قیام اور ملک کی مختلف فرقوں، آبادی کے مختلف النوع عناصر اور اقلیتوں کو مطمئن رکھنے اور ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو (جو ملک کی قیمتی سرمایہ ہے) اپنے مذاہب وعقائد، اپنے تمدنوں اور تہذیبوں اور اپنے معاشرتی و عائلی اصولوں اور نظاموں کی حفاظت ودفاع میں صرف کرنے کے بجائے، ملک کی تعمیر وترقی، اس کی سالمیت کی حفاظت اور اس کے استحکام اور بین الاقوامی عزت ومقام کے کام پر مرکوز رکھنے کے لیے دستور ہند میں دفعہ ۲۵ شامل کی گئی، جس کا تعلق بنیادی حقوق سے ہے، اور جس میں ہندوستانی شہریوں کو پوری مذہبی آزادی دی گئی ہے، اس دستور کے الفاظ حسبِ ذیل ہیں:

> ”امن عامہ، اخلاق اور صحت نیز اس حصہ میں مندرج دوسرے دفعات کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام اشخاص کو ضمیر کی آزادی اور آزانہ طور پر مذہبی عقیدہ رکھنے، اس پر عمل کرنے اور تبلیغ واشاعت کا یکساں حق ہوگا۔“

یہ دفعہ ہندوستان کی سیاسی، نسلی، تمدنی، تہذیبی ونفسیاتی صورت حال کے عین مطابق تھی، اور اس پوری دیانت داری، خلوص اور عزم و فیصلہ کے ساتھ عمل کرنے کی ضرورت تھی، لیکن اس قابل احترام دستور ہند کا جس میں ملک کے ماہرین قانون اور دستور سازوں کی بہترین ذہنی اور قانونی صلاحیتیں صرف ہوئیں جس نے بہت وقت لیا، اور جس کے ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک نقطہ اور شوشہ پر طویل اور عمیق بحثیں اور موشگافیاں ہوئی ہوں گی عجیب وغریب تضاد و دستور ہند کی تاریخ کا ایک معمہ ہے کہ اسی دستور کے دفعہ-۴۴ کی شکل میں یکساں مدنی قانون کی دفعہ (UNIFORM CIVIL CODE) شامل کی گئی، اور اس کو دستور ہند کے رہنما اصول کا درجہ دیا گیا، اس دستور کا متن حسب ذیل ہے:

> ''مملکت، ہندوستان کے پورے قلمرو میں شہریوں کے لئے یکساں مدنی ضابطہ (UNIFORM CIVIL CODE) کے حصول کی سعی کریگی۔''

اس مسئلہ کے دو بڑے محرک ہیں، ایک یہ کہ ''سلطانی جمہور'' کے اس دور میں قانون سازی کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط سمجھا جاتا ہے، اور ''عائلی قانون'' (PERSONAL LAW) زندگی کا ایک ایسا اہم شعبہ ہے جو افراد کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، اور افراد کو ایک دوسرے سے مربوط بھی رکھتا ہے، جن قوموں یا مذہبی فرقوں میں ''آسمانی قانون'' کا کوئی تخیل یا عقیدہ نہیں ہے، اور وہ عائلی قانون کو محض زندگی کے تجربات کا نتیجہ اور خواہشات وضروریات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں (اور بدقسمتی سے دو بڑے آسمانی مذہبوں، اسلام اور یہودیت کے علاوہ عام طور پر مذہبی قوموں اور فرقوں بالخصوص آریائی نسلوں میں یہی تخیل پایا جاتا ہے) ان قوموں اور فرقوں میں اس قانون میں حالات اور ضروریات کے مطابق تبدیلی اور زندگی سے اس کی مطابقت کا احساس اور مطالبہ بالکل قدرتی امر و بدیہی حقیقت ہے، اس لئے کہ وہ انسانوں ہی کے اپنے اپنے زمانہ کے مطابق بنائے ہوئے قوانین ہیں، زمانہ بدل جانے اور حالات تبدیل ہوجانے سے تمدن و تہذیب اور لباس ومعاشرت کی طرح ان میں بھی اصلاح ترمیم وتبدیلی نا صرف جائز بلکہ

بعض اوقات فرض وواجب ہو جاتی ہے۔

دوسرا بڑا محرک کسی ملک کی آبادی کے مختلف عناصر اور اجزاء میں زیادہ سے زیادہ ہم رنگی ووحدت کا وہ عالمگیر رجحان ہے جسکا تقریباً اس صدی کے اوائل سے بڑی قوت و شدت کے ساتھ پروپیگنڈہ کیا گیا ہے اور اس میں ادب، شاعری، علم وسیاست، اور صحافت وخطابت سب نے پورا حصہ لیا ہے۔ یورپ سے (جہاں تقریباً ایک مذہب، ایک طریقۂ زندگی، ایک تہذیب، لیکن متعدد زبانیں رائج ہیں) یہ خیال ان مشرقی اور ایشائی ممالک میں آیا جہاں کئی کئی مذہب، مختلف تہذیبیں ومختلف معاشرتی وعائلی نظام بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ مذہب، تہذیب اور مختلف معاشرتی نظام میں کبھی باہمی نفرت، زور آزمائی اور انتشار کا باعث نہیں ہوئے۔ انتشار وتضاد کا اصل سبب ہمیشہ سیاسی اغراض اور سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے ذاتی مفادات اور اقتدار کی خواہش ثابت ہوا ہے، خود یورپ میں مکمل مذہبی اور معاشرتی وحدت کے باوجود دو دو خوں آشام جنگیں ہو چکیں۔ جن کے شعلوں سے مشرق وایشیا کا دامن بھی نہیں بچ سکا۔ پہلی جنگ عظیم بھی اصلاً وابتداءً برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ہوئی تھی، جرمن اور انگریز دونوں نہ صرف یہ کہ کرسچین ہیں بلکہ پروٹیسٹنٹ بھی ہیں۔ اور ان کا عائلی قانون ومعاشرت تقریباً ایک ہے۔ پھر یہ دونوں دشمنوں کی طرح کیوں لڑے؟ اگر یونیفارم سول کوڈ جنگ کو روک سکتا ہے اور نبرد آزمائی اور تصادم سے باز رکھ سکتا ہے تو اس کو وہاں روکنا چاہئے تھا، پھر دوسری جنگ عظیم کا بھی یہی حال تھا، کہ وہ دونوں ملک اس طرح سے لڑ پڑے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں۔

دور کیوں جایئے آپ اپنے ملک بلکہ شہر کی عدالتوں میں بھی جا کر دیکھ آیئے کہ مسلمان مدعی ہے، اور مسلمان ہی مدّعا علیہ ہے، مسلمان مسلمان کی عزت کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے، اس کے گھر پر ہل چلا دینا چاہتا ہے، ان دونوں کا عائلی قانون بھی ایک ہے، بعض اوقات تو خون بھی ایک ہوتا ہے، دونوں فریق ایک نسل، ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، یہی حال ہندو فرقہ کا بھی ہے کہ اس میں بھی عائلی قانون (Personal

Law) کی یکسانی اوراشتراک کے باوجود مقدمہ بازی، خانہ جنگی، اورایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی میں کوئی دقیقہ اٹھانہیں رکھا جاتا، درحقیقت اختلافات اوردشمنیوں کاتعلق نفسانیت، دولت پرستی کے جنون، حد سے بڑھی ہوئی مادّیت، اوراس نظام ونصاب تعلیم سے ہے جس نے اخلاقیات کویکسرنظرانداز کردیاہے، اس کاتعلق ہرگز عائلی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے، میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ عائلی قانون ایک ہوجانے سے اخلاقی صورت حال میں قطعاً ایک ذرّہ کا فرق بھی نہیں پڑے گا، پھرکیوں بارباراس کاحوالہ دیا جاتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ ہونا چاہئے تاکہ آپس میں اتحاد واُلفت پیدا ہو، طوطے کی طرح اس بات کودُہراتے رہنا سطحیت (Shallowness) مرعوبیت اوراندھی تقلید کی ایک افسوسناک مثال ہے۔

اس موقعہ پرایک مشہور برطانوی ماہرقانون بوڈن ہمیر (E. Bodenheimer) نے فلسفہ قانون اوراس کی سماجی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے جوکچھ لکھا ہے وہ ہماری آنکھ کھولنےاورحقیقت پسندی سے کام لینے کے لیے کافی ہے، وہ کہتا ہے:۔

> ''کسی قانونی نظام سے جس کا منشازندگی میں یکسانیت پیدا کرنا ہو، لوگوں کے ایک بڑے طبقہ میں یہ تأثر پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیاہے، تواس قانون کوٹوٹنے یا اس سے بچنے سے محفوظ رکھنا حکومت کے ذمہ داروں کے لیے انتہائی مشکل ہوگا، لوگ کسی ایسے قانون کوزیادہ دنوں تک برداشت نہیں کرسکتے جسے وہ نامناسب یاناقابل برداشت سمجھتے ہوں، جوحکومت اس قسم کے نظامِ قانون کوبرقرار رکھنے پر مُصر ہو، اسے اس کونافذ کرنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، اس لیےکوئی نظام جس کی بنیادانصاف پرنہ ہوغیرمحفوظ اورپُرخطر ہوگا، جیسا کہ جان ڈکنسن نے کہاہے:
>
> ''ہمیں کسی عام اورمتعین ضابطہ کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایسے ضابطہ کی جس کی بنیادانسانی ضرورت اورصلاحیت پرہو، ورنہ وہ نظام قابل

عمل نہ ہوگا، یہ قانون منصفانہ اقدار اور اندرونی رجحانات کی خلاف ورزی
کرے گا، ہمیشہ اس کی خلاف ورزی کی جائے گی، اور وہ اتنا ناپائیدار ہوگا
کہ اس کا جواز ہی ختم ہو جائے گا''۔(۱)

پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یکسانی اور اتحاد پیدا کرنے کے لیے اگر کوئی قانون کسی آبادی کے کسی عنصر، ملک کے کسی فرقہ اور کسی مذہب کے ماننے والوں کے بنیادی عقائد سے متصادم ہے، تو وہ اتحاد، باہمی تعاون، ملک کی تعمیر و ترقی میں گرم جوشی و خلوص اور سکون و مسرت کا احساس پیدا کرنے کے بجائے، مزید انتشار، بے دلی یا نیم دلی، بلکہ مجبوری اور غلامی کا وہ احساس پیدا کر سکتا ہے، جو کسی آزاد ملک یا متحدہ قومیت کے لیے جذام اور کوڑھ سے کم نہیں۔

حضرات! یہ دین جو ہم تک پہونچا ہے، اور جس دولت کے ہم، آپ امین اور (محافظ کا لفظ تو بڑا ہے) اس دولت کے حامل ہیں، وہ دین ہمیں دانشوروں، سماجی خدمت گاروں، اصلاحی کام کرنے والوں (Social Workers) اور بانیان سلطنت کے ذریعہ نہیں پہونچا، یہ سارے گروہ قابل احترام ہیں، لیکن ''دین'' اور تہذیب، نظام فکر، مکتب خیال (School of Thought) اور خالص مطالعہ، غور و فکر اور تجربہ کے نتائج میں ایک حد فاصل، سرحدی لکیر (Line of Demarcation) ہوتی ہے، جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے، اس خط کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، حدِ فاصل یہ ہے کہ آسمانی مذاہب (ادیان) ان برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہونچے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا، اور جن پر وحی آتی تھی، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے خلط مبحث (Confusion) ہوتا ہے، زیادہ تر لوگ نادانستہ طریقہ پر ان مذاہب سے توقع اور بعض اوقات آگے بڑھ کر ایسی چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں جن کی ان مذاہب میں گنجائش اور ان کا کوئی جواز نہیں، وہ بعض اوقات ان کی تشریح کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے ہیں، اپنی وسعت مطالعہ اور وسعت نظر کے اظہار کے لیے وہ مذاہب کی ترجمانی ایسی کرنے لگتے ہیں جیسے کہ یہ نرے فلسفے یا انسانوں کے بنائے ہوئے تہذیب و تمدن کے نظام اور سماجی تجربے

E. Bodenheimer, Jurisprudence, Harvard, 1967, P. 212.(۱)

اور معاشرتی نظریات ہیں۔

یہ ہے وہ غلطی جو نادانستہ طریقہ پر بعض بڑے ذمہ دار اور سنجیدہ لوگوں سے ہوتی ہے، وہ یہ نہیں جانتے کہ دین اور غیر دین میں حدّ فاصل اور امتیازی نشان کیا ہے؟ فلسفۂ سماجیات (Sociology) کا علم، تہذیب وتمدن (Civilization) سوسائٹی اور انسانی معاشرہ، سب اپنی جگہ حقائق ہیں، ہم ان کا انکار نہیں کرتے، ان کا احترام کرتے ہیں، اور اپنے ذمہ ان کے حقوق سمجھتے ہیں، خود مسلم ملت ایک معاشرہ، تہذیب وتمدن اور فکر ودانش کا ایک مستقل مدرسہ (School of thought) بھی ہے، لیکن اس کی جو اصل حقیقت ہے، وہ یہ کہ وہ ایک ''دین'' ہے، اور اس کو دنیا میں پیش کرنے والے، اور اس کو بروئے کار لانے والے، اس کو ہماری زندگی میں داخل کرنے والے انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام ہیں، اور یہ ان کی زبان اور ان کا طرز فکر نہیں، اس کا بنیادی چشمہ ان کے دماغ میں نہیں تھا، بلکہ ان سے باہر اور ان سے بلند تھا، اور وہ ان کے لیے اسی درجہ قابل احترام اور قابلِ اطاعت تھا، جیسے ہمارے آپ کے لیے اور سارے امتیوں کے لیے ہے:۔

''وَمَایَنطِقُ عَنِ الْهَوىٰ، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحیٰ''. (سورۃ النجم:۳،۴)

اور وہ خواہش نفس سے منھ سے بات نہیں نکالتے ہیں، یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے (اور ان کی طرف بھیجا جاتا ہے)

''مَا کُنتَ تَدرِیْ مَاالْکِتٰبُ وَلَاالْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰهُ نُوراً نَّهدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ط وَاِنَّکَ لَتَهدِیْٓ اِلیٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِیمٍ''. (سورۃ الشوریٰ:۵۲)

تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے نہ ایمان کو ہم نے اس کو ایک نور کی طرح آپ کے سینہ میں اتارا، اور اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں، ہدایت کرتے ہیں، اور بے شک (اے محمدؐ) تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو۔

علم وتجربہ، اور وحی ونبوت کا فرق اساسی فرق ہے، ہمیں غیر مسلم فضلاء سے زیادہ شکوہ نہیں کہ وہ وحی ونبوت کے عہد سے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ ان کے مفہوم سے بھی بہت

سے حضرات نا آشنا ہیں، بعثت محمدی سے پہلے خود عربوں کا یہی حال تھا، اس میں نہ کسی ذہانت کا انکار ہے، اور نہ کسی کی نیت پر حملہ ہے، ایک تاریخی اور نفسیاتی تجزیہ یہ ہے کہ جو شخص نبوت اور وحی کی حقیقت سے واقف نہیں، اور یہ نہیں جانتا کہ اس کا کیا مرتبہ اور حق ہے، اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ کس چیز کی متقاضی ہے، وہ مسلمانوں کے بارہ میں مشورہ دینے یا فیصلہ کرنے کا اخلاقی یا قانونی طور پر مجاز نہیں۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک تاریخی وعلمی حقیقت ہے کہ کئی مذاہب ایسے ہیں کہ وحی ونبوت سے ان کا آغاز ہونے کے باوجود انھوں نے مذہبی زندگی کو ایک خاص دائرہ میں محدود کرلیا ہے، مثلاً عبادات کے دائرہ میں، لیکن اسلام کا معاملہ یہ نہیں ہے، اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے، یہ ایک اساسی حقیقت ہے، جو عبد ومعبود کے تعلق کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی، ہر مسلمان خدا کا فرماں بردار بندہ ہے، اور اس کا تعلق خدا سے دائمی بھی ہے، عمومی بھی، عمیق بھی ہے، اور وسیع بھی، متعین بھی ہے اور جامع بھی، قرآن شریف میں ہے:۔

"يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ، اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ". (سورة البقرة:۲۰۸)

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔

اس لیے اگر مسلمان مسلم پرسنل لا (شرعی عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کرلیں گے تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے، اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں۔

حضرات! فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ نفسیات اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت وتہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر ومحفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے، اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں

مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اپنے عائلی وخاندانی روابط وتعلقات میں مسلمان نہیں، حقوق کی ادائیگی اور ترکہ کی تقسیم میں مسلمان نہیں۔

اس لیے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت، نظام تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اس کو دعوتِ ارتداد سمجھتے ہیں، اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے جیسے دعوت ارتداد کا کرنا چاہئے، اور یہ ہماری شہری، آئینی، جمہوری اور دینی حق ہے، اور ہندوستان کا دستور، اور اس جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقا اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی، اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون واطمینان میں مضمر ہے۔

ملک آزاد ہونے کے بعد ہی تیز اور دور بیں نگاہ رکھنے والوں کو یہ نظر آیا کہ اُفق پر خطرہ کی علامتیں نمایاں ہوگئی ہیں، یکساں سول کوڈ (Uniform Civil Code) اور عائلی قوانین میں ترمیم کی صدائیں (کسی قدر خاموشی کے ساتھ) بلند ہونے لگی ہیں، اور انھوں نے محسوس کرلیا کہ یہ بادل جو ابھی کسی کسی وقت گرجتا ہے، کسی وقت ضرور برسے گا، تو انھوں نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے نام سے دسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں ایک متحدہ پلیٹ فارم بنایا جس سے وقتاً فوقتاً قانون سازی کی نوعیت اور اس کے رُخ کا جائزہ لیا جاتا رہے، اور مسلمانوں کی رائے عامہ کو بیدار رکھنے کا سامان کیا جاتا رہے، تاکہ اچانک ان پر یہ یا کوئی دوسرا مسئلہ شب خون نہ مارنے پائے، یہ ایک ایسا نمائندہ بورڈ تھا، جس کی مثال اپنی وسعت اور عمومیت اور مختلف مکاتب خیال کی نمائندگی کے لحاظ سے تحریک خلافت کے بعد نہیں ملتی، ۱۹۴۷ء کے بعد اتنے بڑے اجتماعات دیکھنے میں نہیں آئے، اس بورڈ کی تشکیل اور اس کے ان شاندار اور بے نظیر جلسوں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ حکومت اور پرسنل لا میں اصلاح وترمیم کی آواز بلند کرنے والے حضرات کو ہوا کا رُخ معلوم ہوگیا، اور اتنا ثابت ہوگیا کہ مسلمان اس مسئلہ پر صد فیصد متفق ہیں، اس لیے دانش مندی، حقیقت پسندی اور انتخابی سیاست کا بھی تقاضہ ہے کہ اس مسئلہ کو اٹھانے میں احتیاط کی جائے۔

یہ صورت حال قائم تھی، اور مسلمان اقلیت اور اس معاشرہ و ماحول کے دریا کی سطح ساکن تھی کہ ۲۳؍اپریل ۱۹۸۵ء کو سپریم کورٹ نے شاہ بانو کیس میں نفقۂ مطلقہ کے بارے میں وہ ہنگامہ خیز فیصلہ دیا، جس سے ملت اسلامی، مسلم معاشرہ، علماء اور دانشوروں اور مسلم ماہرین قانون کے حلقہ میں ایک ایسا تلاطم اور طوفانی کیفیت پیدا ہوئی، جس کی نظیر اپنی وسعت وعمومیت، شدت احساس بلکہ اذیت وکرب کے لحاظ سے عظیم فرقہ وارانہ فسادات، خون ریزی وانسان سوزی کے لرزہ خیز واقعات کے معاملہ میں بھی نہیں ملتی، اس لیے کہ یہ مسلمانوں کے تہذیبی، معاشرتی ارتداد، شریعت اسلامی سے بغاوت اور اس کے برکات سے محرومی کا پیش خیمہ اور:۔

"وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ". (سورة المائده: ٤٤)

جو کوئی اللہ کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

کی وعید کا مصداق بنانے والا فتنہ تھا، اور وہ حقیقتاً غیر مسلم جج صاحبان، یا قرآن وحدیث وتفسیر، فقہ، اصول فقہ، اور عربی زبان میں مہارت خصوصی نہ رکھنے والے مسلمان ججوں کے لیے قرآنی آیات، اس کے الفاظ واصطلاحات کی دوسری زبانوں کے ترجمہ کی مدد، سکنڈ ہینڈ معلومات، سطحی اور عاجلانہ مطالعہ اور بعض اوقات "ترقی پسند" یا بیرونی اثرات وموثرات سے تأثر کا نتیجہ تھا، اور اس سے من مانی تفسیر اور خواہشمندانہ (Wishful) تشریح کا دروازہ کھلتا تھا، یہ نہ صرف دین وشریعت، مذہبی صحیفوں، بلکہ دنیا کے دائمی عالمگیر اصول اختصاص (Specialisation) اور علوم وفنون میں "اتھارٹی" کے تسلیم واحترام کے اس اصول کے خلاف تھا، جو ساری علمی، فنی دنیا میں صدیوں سے تسلیم کیا جا رہا ہے، اور جس پر زبان وادب، فلسفہ، منطق، سائنس، وٹکنالوجی، اجتماعیات ومدنیات کا نظام چل رہا ہے۔

اس موقعہ پر ہندوستان کی ملت اسلامیہ نے اپنے دین وشریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری، اور ملی غیرت وخودداری کا ایسا ثبوت دیا، جس کی نظیر عرصۂ دراز سے ملّی ودینی تحریکات کی تاریخ میں دیکھنے میں نہیں آئی، ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے

سرے تک عظیم الشان جلسے ہوئے، جن میں بعض اضلاع اور چھوٹے مقامات میں ایک ایک لاکھ سے زیادہ کا مجمع تھا، کلکتہ کے جلسہ عام میں جو ۷/اپریل ۱۹۸۵ء کو شہید مینار میدان میں منعقد ہوا تھا محتاط اندازہ کے مطابق پانچ لاکھ (500000) (نصف ملین) انسان تھے، شمالی ہند سے جنوبی ہند کے آخری سرے، کشمیر کی فلک بوس چوٹی سے جنوب میں کنیا کماری تک جلسوں کا ایک طوفان امنڈ پڑا، جس میں بورڈ کے ذمہ دار ارکان اور ملک کے ممتاز ترین علماء بذات خود شریک تھے، اس کے علاوہ وزیر اعظم ہند مسٹر راجیو جی اور وزیر قانون کے نام ہزاروں کی تعداد میں احتجاجی تار اور جلسوں کی تجویزیں بھیجی گئیں۔

اس کے بالمقابل انگریزی و ہندی پریس نے اس مسئلہ پر ایسی مخالفانہ صف آرائی (Confrontation) کا مظاہرہ کیا، جس کی مثال شاید تقسیم ہند اور جداگانہ قومیت کے مسئلہ پر بھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی، پریس اور فرقہ پرست جماعتوں کی قیادت نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کی شدت احساس، اس فیصلہ کو تبدیل کرانے کی کوشش اور ایک جزوی عائلی مسئلہ میں اسلام کے قانون شرعی پر عمل کرنے کی اجازت کو بحال رکھنے کے مطالبہ کو جس سے ایک فرقہ (مسلمانوں) کے ایک محدود طبقہ (خواتین) کی ایک چھوٹی سی تعداد (مطلقہ خواتین) متاثر ہوتی تھی -- کو اس نظر سے دیکھا، گویا اس ملک پر کوئی غیر ملکی طاقت حملہ کرنے والی ہے، یا کوئی ہیبت ناک کوہ آتش فشاں پھٹنے والا ہے، یا کوئی مہلک وبا پھیلنے والی ہے، جیسا کہ میں نے اپنے دہلی کے ڈائلاگ اور پریس کانفرنس میں کہا تھا، انھوں نے اس بارے میں اصول "احساس تناسب" (Sense of Proportion) کو بھی بالائے طاق رکھ دیا۔

اس ملک گیر عوامی احتجاج اور عظیم الشان جلسوں کے ساتھ (جس میں نظم واحترام قانون اور سنجیدگی، وقار کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے) بورڈ کے ذمہ داروں نے وزیر اعظم ہند راجیو جی سے اور ان کے اشارہ وہدایت سے جمہوریۂ ہند کے وزیر قانون مسٹر اشوک سین اور ان کے رفقاء سے رابطہ قائم رکھا، انھوں نے راجیو جی سے دو تین مرتبہ شخصی اور خصوصی

ملاقاتیں کیں، اور آزادانہ و بے تکلفانہ فضا میں اس کو اس مسئلہ کی نوعیت واہمیت مذہبی وشرعی نقطہ نظر اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے جذبات وتأثرات سے واقف کرانے کی مخلصانہ کوشش کی، راجیوجی نے بھی (جن کو یقیناً اس سلسلہ میں مسلمانوں کے اضطراب وبے چینی اور عظیم الشان جلسوں کی رپورٹ پہونچ چکی ہوگی) صبر وسکون اور احترام کے ساتھ یہ باتیں سنیں اور وہ اس بارے میں مطمئن ہوگئے، کہ یہ مسلمانوں کا خالص مذہبی مسئلہ ہے، اور اس کی صحیح ترجمانی وہی علماء کر سکتے ہیں، جن کا دین کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہے، اور وہ مسلمانوں کے نزدیک دین وشریعت کے معتبر ترجمان ہیں، اور اس سے وہ کوئی سیاسی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے، چنانچہ انھوں نے ایک سے زائد بار اس کا اظہار کیا کہ انھوں نے اس مسئلہ پر نامور علماء سے تبادلۂ خیال کرلیا ہے، اور وہ مطمئن ہیں کہ اسلام طبقۂ اناث بشمول مطلقہ خواتین کے حقوق کا پورا تحفظ کرتا ہے، اس سلسلہ میں یہاں تک ان کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ "وہ موجودہ قانون سے بھی زیادہ ان کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے، اور ان کو حق دیتا ہے"۔ وہ حقیقت پسندی، اخلاقی جرأت اور احساس ذمہ داری اور عزم وفیصلہ کے ساتھ مطلقہ خواتین کے حقوق کے تحفظ کا بل پارلیمنٹ میں لائے، اور اس پر واضح اور طاقتور وھپ (Whip) جاری کیا۔

اس بل کے پارلیمنٹ میں پیش کئے جانے سے پہلے بورڈ کے ذمہ داروں اور قانون داں ممبروں نے اس کا گہری نظر سے مطالعہ کیا، ان کو اس میں متعدد خامیاں، اور اصلاح طلب نقاط نظر آئے، چند ممتاز قانون داں شرکائے کار نے احتیاط کے ساتھ اور ضروری حد تک ایک مختصر فہرست ترمیمات واصلاحات کی مرتب کی اور صدر بورڈ نے اپنے ہاتھوں سے براہ راست وزیر اعظم صاحب کو بل کے پارلیمنٹ میں آنے سے پہلے پیش کی اور ان سے درخواست کی کہ بل کے پیش کرنے سے پہلے وہ ان کی روشنی میں بل کو اس مکمل اور صحیح شکل میں پیش کرنے کی تکلیف گوارا کریں، جس سے وہ اس مقصد کی پورے طور پر تکمیل کرے جس کے لیے یہ ساری جدوجہد کی گئی ہے، انھوں نے اس کا وعدہ کیا، لیکن اس تھوڑے

وقت میں وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے، انھوں نے اس کو اس کی موجودہ شکل میں، ایک بار منظور ہو جانے کو بڑی کامیابی تصور کیا، اور وعدہ کیا کہ وہ یہ خامیاں دوسرے موقعہ پر دور کریں گے، اور ۶ رمئی ۱۹۸۶ء کو "تحفظ حقوق مسلم مطلقہ" بل کے عنوان سے کھلی اکثریت کے ساتھ پاس ہوا، اور مسلمانوں نے ایک ایسی ملت کی طرح (جو تائید و مخالفت اور خلوص و سیاست میں فرق کرنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوئی) اس شریفانہ اور جرءت مندانہ اقدام کا پوری فراخ دلی اور جذبۂ شرافت کے ساتھ اعتراف، اور اپنے تشکر و امتنان کا اظہار کیا۔

محترم سامعین! درمیان میں قبل اس کے کہ بل پر پارلیمنٹ میں بحث ہو ایک اور نازک مرحلہ پیش آ گیا، بل کے پیش ہو جانے کے بعد مخالفین نے ایک قانونی نکتہ اٹھایا، اور جسٹس آئر نے صاف کہا کہ اس بل کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جائے گا، اور چونکہ یہ بل دستور کی دفعہ ۱۴ ر اور ۱۵ کے خلاف ہے، اور دستور میں دی گئی ذاتی آزادی (قانون کی نظر میں یکساں حقوق اور مذہب وصنف کی بنا پر عدم امتیاز) سے ٹکراتا ہے، اور ہندوستان کے باشندوں میں ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتا ہے، اس لیے سپریم کورٹ بہر حال اس بل کو مسترد کر دے گا کہ ایسی قانون سازی جو دستور ہند کی دفعات کے خلاف ہو اسے مسترد کرنا سپریم کورٹ کی ذمہ داری ہے، ان حالات میں بل میں ایک دفعہ کا اضافہ کیا گیا ہے، جس کا مفاد یہ ہے کہ اگر کوئی "بدنصیب" مطلقہ اس بل سے مطمئن نہ ہو، اسلامی قانون کے تحت نفقہ حاصل کرنا نہ چاہتی ہو، بلکہ وہ دفعہ ۱۲۵ ہی کے ذریعہ نفقہ حاصل کرنا اپنے لیے صحیح سمجھتی ہو تو ایسی درخواست دے سکتی ہے اور پھر مجسٹریٹ دفعہ ۱۲۵ ہی کے تحت اس کا فیصلہ کرے گا۔

ترمیم میں یہ کہا گیا کہ صرف مطلقہ کا درخواست دینا اور دفعہ ۱۲۵ کے ذریعہ فیصلہ حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کرنا قطعاً کافی نہ ہوگا، بلکہ مطلقہ اور اس کے سابق شوہر دونوں کی رضامندی ضروری ہوگی، اور دونوں کی مشترکہ درخواست کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکے گا، جس کی توثیق حلف نامہ کے ذریعہ کی گئی ہو، اور اگر تنہا مطلقہ نے درخواست کی تو پھر اس کا فیصلہ بل کے ہی مطابق ہوگا، دفعہ ۱۲۵ کے مطابق نہیں، دوسری شرط یہ لگائی گئی کہ یہ درخواست اور رضا

مندی مقدمہ کی سماعت کے پہلے ہی دن ہونی چاہئے ورنہ قابل قبول نہ ہوگی۔

یہ گفتگو ۱۹راپریل ۱۹۸۶ء کو ہوئی، ہم لوگوں کو اندازہ ہوگیا کہ کسی ہوشیار اور باریک بین مخالف قانون داں نے وزیر قانون یا راجیو جی کے کسی اہم مشیر کار کو سمجھایا ہے، اب اگر ہم اس کو مسترد کردیتے ہیں، تو پھر جہاں سے چلے تھے وہیں آجائیں گے، اور عنقریب پیش ہونے والا بل تعویق میں پڑجائے گا، یا تعطل کا شکار ہوجائے گا، راجیو جی کے قریب ترین مشیر کار نے اس کا بھی اشارہ کیا کہ اگر آپ نے یہ اضافہ مان لیا تو گورنمنٹ خود بل کی حفاظت اور اس کے لیے قانونی چارہ جوئی کرے گی، ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس اضافہ میں دو شرطیں لگا کر دفعہ ۱۲۵، کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں، اور عملاً اس کو بیکار کردیا گیا، دفعہ ۱۲۵ کے ذریعہ شوہر کو تا نکاح ثانی یا حین حیات نفقہ دینا پڑتا ہے، کوئی نادان شوہر ہی ہوگا، جو دفعہ ۱۲۵ کے ذریعہ نفقہ کا فیصلہ کرانا چاہے گا، اور مطلقہ کی دی ہوئی درخواست پر اپنی رضامندی ظاہر کرے گا، اور اس پر دستخط ثبت کرے گا، اور کوئی ناخدا ترس اور ناسمجھ مطلقہ ہی ایسی ہوگی جو اسلامی قانون کو چھوڑ کر جس میں اسے ہر مرحلہ میں نفقہ کی ضمانت ہے، ایسے غیر شرعی قانون کو ترجیح دے گی، جس میں اس کے نفقہ کا انحصار شوہر کی خوشحالی اور زندگی پر ہے، اگر شوہر مفلس ہے، یا اس کا انتقال ہوجائے تو پھر مطلقہ کے لیے پریشانی اور حیرانی کے سوا کچھ نہیں۔

برادران ملت!

اب میں اس مجمع کو ایمانی وقرآنی زبان میں خطاب کرنا چاہتا ہوں، اور آپ کے عملی زندگی کا محاسبہ کرتا ہوں، آپ دیکھئے، آپ اسلامی اور قرآنی قانون معاشرت کا خود کتنا احترام کرتے ہیں، اس پر خاندانی روایات کو اور رسم ورواج کو کتنی ترجیح دیتے ہیں، اس پر اس کا اضافہ کیجئے جو آپ نے اپنے ہم وطنوں سے سیکھا ہے، جہیز کا بڑھا چڑھا مطالبہ ہم میں کہاں سے آیا، اس کو کسی نام سے یاد کیا جاتا ہو، یہ چیز کہاں سے آئی، مکہ، مدینہ، حرمین شریفین سے آئی ہے، قرآن مجید کے راستہ سے آئی ہے، یہ لعنت کہاں سے آئی ہے؟

جب آپ اس کو قبول کرتے ہیں تو بطور سزا کے آپ کی غیرت ملّی کو، آپ کے وجود ملی کو بار بار نشانہ بنایا جاتا ہے۔

میں بیانگ دُہل اعلان کرتا ہوں کہ ہم لوگ (شرعی قانون میں قانون سازی کے ذریعہ مداخلت کی) جو شکایت کرتے ہیں وہ شکایت بجا ہے، ہم شکایت کرتے رہیں گے، شکایت کرنا ہمارا حق ہے۔

ایک جمہوری ملک میں جہاں قانون چلتا ہو، جہاں ہر شہری کو برابر کا حق دیا گیا ہو، وہاں ہر شہری کو، اور شہریوں کی ہر تنظیم کو، اور آبادی کے ہر عنصر کے نمائندوں کو یہ حق ہے کہ پارلیمنٹ (ایوان قانون ساز) میں اپنے قومی عوامی جلسوں میں، اپنی مجلسوں میں اور اخباروں کے کالموں میں وہ اس بات کی شکایت کریں کہ ہمارا فلاں حق نہیں مل رہا ہے، ہمارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، کوئی ملک جس کی جمہوریت پر بنیاد ہو، جو جمہوری ہو اس کے بغیر نہیں چل سکتا۔

حقیقت پسند حکومتیں اس بات کا اہتمام کرتی ہیں کہ ان کے ایوانِ قانون ساز میں ایک حزب مخالف رہے، ایک اپوزیشن پارٹی ہو، تاکہ اس کے ذریعہ حکومت کو اپنی خامیاں معلوم ہوتی رہیں، اور اس کو ملک کی آبادی کو زیادہ مطمئن کرنے اور مطمئن رکھنے کا موقعہ ملتا رہے، اسی لیے ہم اپنی حکومت سے شکایت کرتے رہیں گے اور سو بار کریں گے، اور اس کو اس پر فخر کرنا چاہیئے کہ ہمارے ملک میں شکایت کرنے کا حق ہے، یہ حق سلب نہیں کیا گیا ہے، ہمیں اپنی آواز بلند کرنے کا حق ہے، ہم اس میں ملک کی فلاح سمجھتے ہیں، وہ ملک خطرہ میں ہے، جہاں زبان بندی کا قانون نافذ کیا جائے، جہاں کسی کو کراہنے اور آہ کرنے کی اجازت نہ ہو، اس لیے ہمارے ملک کا یہ افتخار ہمارے اس ملک کی یہ خصوصیت باقی رہنی چاہیئے، ہم ہمیشہ اپنے آئین ساز بھائیوں سے اور ارکانِ حکومت سے، انتظامیہ اور حکمراں جماعت سے شکایت کریں گے۔

لیکن جب ہم اپنی حکومت اور برادران وطن سے شکایت کرتے ہیں، تو ہمیں آپ سے شکایت کرنے کا حق کیوں نہ ہو؟ ان سے تو شکایت کریں گے، اور ان کا دامن

پکڑیں گے،لیکن آپ کا گریبان پکڑلیں گے، اوروہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہوگا وہ دینی احتساب کا ہاتھ ہوگا، وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا، جوآپ کا گریبان پکڑے گا، اور کہے گا کہ پہلے تم اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھو کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو،تمہاری نگاہوں میں اس قانون کی کتنی حرمت ہے؟

تم جہاں اس قانون کو چلا سکتے ہو وہاں چلا رہے ہو کہ نہیں؟ تم اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے قانون کو چلائے، اس کا احترام کرے، یہ کیا بوالعجبی ہے؟

یہاں سے یہ عہد کر کے جایئے کہ اب قانون شریعت پر آپ چلیں گے، یہ جہیز کی کیا مصیبت ہے؟ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کئے جاتے ہیں، ان کے پورا نہ ہونے پر یہ معصوم لڑکیاں جلادی جاتی ہیں، ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں، صرف دہلی میں ہر بارہ گھنٹے پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے(۱) کیا اس کائنات کے خالق اور نوع انسانی کے مربی (جس کے مخلوق مرد وعورت دونوں ہیں) کو یہ چیز گوارا ہوسکتی ہے؟ کیا اس ظلم کے ساتھ کوئی ملک، کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے، خدا کی رحمت ونصرت کا مستحق ہوسکتا ہے؟ آپ ''رحمۃ للعالمین'' کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی ہمت نہیں ہونی چاہئے تھی، میں نے دہلی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

''وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيهِمْ، وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ''. (سورة الانفال:۳۳)

اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے انھیں عذاب دیتا، اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور انھیں عذاب دے۔

ایسا ہی ترکہ شرعی طریقہ پر تقسیم ہونا چاہئے، نکاح، شرعی طریقہ پر ہونا چاہئے،

---

(۱) بحوالہ ''قومی آواز'' دہلی، ۱۰؍جون ۱۹۸۴ء

اور بیویوں کی تعداد وہی ہونی چاہئے جو شریعت میں بیان کی گئی ہے، طلاق کا مسنون طریقہ معلوم کرنا چاہئے، مسنون اور افضل طریقہ کیا ہے؟ پھر اس کے بعد فقہی طلاق جس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے، اس کو سمجھنا چاہئے کہ طلاق رجعی کیا ہوتی ہے؟ طلاق بائن و مغلظہ کیا ہوتی ہے؟ پھر اس میں طلاق کو آپ یہ سمجھیں کہ طلاق ابغض المباحات ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: کہ جائز ہے، لیکن آخری درجہ کی چیز ہے، بڑی مجبوری کی چیز ہے، جو اپنے کو حرام چیزوں سے اور زندگی کو تلخ بننے سے بچانے کے لیے بہت مجبوری سے دل پر پتھر رکھ کر اختیار کی جاتی ہے، یہ نہیں کہ طلاق ایک فیشن ہو گیا ہے، جو لوگ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے ہیں، اس میں تھوڑی سی ہماری کوتاہی کو بھی دخل ہے، جتنا طعنہ دیتے ہیں، اتنے کے مستحق تو ہم ہرگز نہیں ہیں، لیکن یہ مسئلہ قابل توجہ ہے۔

حضرات!

اس موقعہ پر بورڈ کے بعض نئے اقدامات اور کارگزاری کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا۔

۱۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، امارت شرعیہ، بہار واڑیسہ اور اس کے واجب الاحترام امیر کی ذاتی نگرانی میں مستند علماء اور ماہرین فقہ کے ذریعہ جدید زبان واسلوب وترتیب کے ساتھ عائلی قانون اور مسائل نکاح وطلاق وحقوق وفرائض کی تدوین کا کام جو چند مہینے پہلے شروع کیا گیا تھا، مرتب ہو کر ممتاز وصاحب فن علماء کی نظر سے گزر کر مکمل ہو گیا ہے، اس کی ترتیب کے بعد عدالتوں اور مجلس قانون ساز اور معترضین کو یہ کہنے کا حق نہیں رہا، کہ ہمارے پاس قدیم تراجم کے علاوہ جو زیادہ تر غیر مسلم قانون دانوں اور مصنفین کی مرتب کی ہوئی ہیں، شریعت اسلامی کا مستند و براہ راست مجموعۂ قوانین نہیں ہے۔

۲۔ اس کے ساتھ اصلاح معاشرت، اصلاح رسوم اور مسلمانوں کی عائلی زندگی کو شرعی احکام، قرآنی تعلیمات اور اسوۂ نبوی کی روشنی میں منظّم و بہتر بنانے کی کوشش بھی جاری ہے، اور جا بجا دار القضاء بھی قائم کئے جا رہے ہیں، تا کہ مسلمان اپنے تنازعات اور مسائل خاص شریعت کی روشنی میں حل کریں، اور امکانی حد تک مقدمات واختلافات کا فیصلہ کرانے

میں (خصوصیت کے ساتھ جن کا تعلق احکام شرعی سے ہے) خود کفیل ہو جائیں۔

۳۔ بورڈ کے ذمہ داروں نے بعد میں پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں جن کا سو فیصدی صحیح اندازہ پہلے سے کرنا مشکل تھا، اس بل کی افادیت کو عملاً ثابت کرنے اور اس سے قانونی طور پر فائدہ اٹھانے کی صلاحیت کو برقرار رکھنے کے لیے دو کام ضروری سمجھے، ایک یہ کہ بل پر از سر نو ماہرین فقہ اور ممتاز قانون داں (جن کی خوش قسمتی سے خود ارکان بورڈ میں اطمینان بخش نمائندگی ہے) غور، تبادلۂ خیال اور بحث و مباحثہ کے بعد اس کو ایسی ترمیم شدہ شکل میں جو اس مثبت اور تعمیری انداز میں ہو جس سے بل کی بنیادی ضرورت اور افادیت اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کی تاریخی بلکہ تاریخ ساز جدوجہد لاحاصل اور ''کوہ کندن وکاہ برآوردن'' کے مصداق نہ معلوم ہو، اصلاح شدہ بل کو مؤثر اور موقر نمائندگی کے ذریعہ وزیراعظم کو پیش کیا جائے، اور ان سے درخواست کی جائے کہ وہ اس ترمیم شدہ مکمل بل کو (جو اپنے قدیم دائرہ ہی کے اندر رہے) پارلیمنٹ میں پیش کر کے دوبارہ منظور کرائیں، یا وہ طریقہ اختیار کریں، جس سے یہ بل موجودہ شکل میں نافذ العمل ہو، اس طرح وہ اس جمہوری تقاضہ اور ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت اور فرقہ کے ایک جائز مطالبہ کو (جو خالص مذہبی بنیاد پر ہے) منظور کرا کے حقیقت پسندی، جمہوری روح اور ملک کی آبادی کے ایک بڑے حصہ کو جو ہندوستان سے باہر بھی دنیا کے وسیع ترین رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے، مطمئن اور شکر گزار ہونے کا موقعہ دیں گے، اور یہ بات صرف مسلمانوں ہی کے نہیں، ملک کے مفاد میں ہوگی، بورڈ اس سلسلہ میں جلد عملی اقدامات کرے گا، اور اس کا نتیجہ ملک کے سامنے آئے گا۔

دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ وزارت قانون یا سپریم کورٹ کے ذریعہ عدالتوں کو یہ اطلاع دے دی جائے، کہ مسلم مطلقہ کے معاملہ میں اب زندہ، فعال اور نافذ العمل دفعہ ''مسلم مطلقہ کے حقوق کے تحفظ'' کا (ترمیم شدہ شکل میں) یہ نیا بل ہے، جو ۶ رمئی ۱۹۸۶ء کو پارلیمنٹ نے پاس کیا، اس لیے کہ یہ دیکھا جا رہا ہے کہ عدالتیں اس بل سے تجاہل

عارفانہ برتتی ہیں، یا اس کو نظر انداز کر کے دفعہ ۱۲۵ ہی کے مطابق فیصلہ کر رہی ہیں، جیسا کہ گجرات اور کیرالا وغیرہ کے ہائی کورٹ کے فیصلہ سے ظاہر ہوتا ہے، دوسرے اس حقیقت کا بھی اظہار رہوا ہے، کہ خود وہ وکلاء اور ایڈوکیٹ جو طلاق دینے والے فریق (مرد) کی طرف سے بحث کرتے ہیں، وہ یا تو اس بل سے سرے سے ناواقف ہیں، یا وہ اس کو نافذ العمل ثابت کرنے کے لیے دلائل پیش کرنے اور کامیاب بحث کرنے میں پہلو تہی کرتے ہیں، اور اس کی صحیح وکالت نہیں کرتے، اس لیے ملک کے قانون داں طبقہ کو بھی (خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں) صحیح معلومات فراہم کرنا اور ان کو صحیح صورت حال سے واقف کرنا ضروری ہے، اور بورڈ کو اس سلسلہ میں علمی اور قانونی طور سے اس طبقہ کو (اگر رہنمائی کا لفظ اس کے شایان شان نہیں) مواد مہیا کرنے اور (Feed) کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ تجاہل اور تغافل کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا، اور یہ پاس شدہ بل اوراق کی زینت بن کر رہ جائے گا، امید ہے کہ بورڈ اس سلسلہ میں بھی جلد اقدام کرے گا۔

آخر میں آپ کے اس اعتماد و اعزاز کا نیز آپ کی توجہ و التفات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کا آپ نے مجھے اپنے خیالات کے بے لوث اور آزاد طریقہ پر پیش کرنے کی اجازت دے کر اظہار فرمایا۔

ہمیں خوشی ہے کہ یہ اجلاس ایک ایسے تاریخی شہر میں ہو رہا ہے، جس نے ملّی مسائل، دینی تعلیم، تحریک خلافت و آزادی میں شایان شان حصہ لیا، جہاں سے سب سے پہلے تحریک ندوۃ العلماء کا آغاز ہوا، اور اس کے ابتدائی جلسے اور مشاورتی مجالس ہوئیں، جن میں اس عہد کے ممتاز و سربرآوردہ علماء شریک ہوئے، جس سے ندوۃ العلماء کی بنیاد پڑی اور ایک تعلیمی تجربہ گاہ دارالعلوم کا منصوبہ تیار ہوا، جس کے لیے حکمت الٰہی نے اسی شہر کے ایک پڑوسی (شہر) لکھنؤ کا انتخاب کیا، یہیں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے بانی و مفکر حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کے والد نامدار، شیخ وقت حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء کا بڑا وقت گزرا، اور یہیں ندوہ کا تخیّل ان کے ذہن میں آیا، یہیں

مچھلی بازار کی مسجد پر انگریزی حکومت کے ایک ناروا اقدام پر سارے ہندوستان میں ناراضگی، حفاظت مساجد اور حمیت دینی کی لہر دوڑ گئی، جس کی مؤثر و ولولہ انگیز ترجمانی امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے پُرزور قلم سے ''الہلال'' میں کی، اور اس میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا تلاطم خیز مضمون ''مشہد اکبر'' نکلا، یہ تاریخی یادیں اور یہ قابل فخر خصوصیات اس شہر کے لیے، اس اہم اجلاس وسیمنار کے انعقاد کے لیے نہ صرف جواز بلکہ استحقاق پیش کرتی ہیں۔

عائلی قانون کی وحدت

غیر محفوظ اور پُرخطر

خطبہ صدارت

اجلاس دہم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

منعقدہ ۲۳، ۲۴ر نومبر ۱۹۹۱ء، بمقام دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ وحدہ والصلاۃ والسلام علی من لا نبیَّ بعدہ

حضرات!

ایک ایسے وقت میں کہ ملک سیاسی، آئینی، اقتصادی، اجتماعی اور اخلاقی انتشار اور بحران کے ایسے دور سے گزر رہا ہے جس سے اس کا حال غیر معتدل (Abnormal) اور مستقبل پرخطر ومشکوک نظر آنے لگتا ہے، اور جہاں جانوں، عزتوں مذہبی آزادی، جمہوری قدروں اور نفس مذاہب وادیان اور ان کے مرکزوں کے بقا وسلامتی ہی کا مسئلہ درپیش ہے، پھر دہلی جیسے حساس اور فیصلہ کن شہر میں جس کو اس صورت حال اور حقائق ومسائل کا ذمہ دارانہ اور فیصلہ کن مرکز کی حیثیت سے سامنا کرنا پڑ رہا ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا ہمہ گیر پیمانہ پر سالانہ اجلاس بلانا اور مسلم پرسنل لا اور اس کے سلسلہ میں درپیش خطرات وامکانات کا جائزہ لینا اور ان کی طرف متوجہ کرنا ایک بے ''وقت کی شہنائی'' معلوم ہوئی ہے۔

لیکن بغیر کسی معذرت اور طویل تمہید کے یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ خالص ملک کے مفاد میں ہے اور ایک بروقت اور برمحل اقدام ہے جس کے لئے ملک کے بہی خواہوں اور حقیقت پسند اشخاص، اداروں، حکومت کے ذمہ داروں اور تمام باضمیر انسانوں کو شکر گزار ہونا چاہیئے اور اس کا پورا نوٹس لینا چاہیئے کہ اس کے بغیر جمہوریت اور اس ملک کا خمیر وضمیر اور اس کا امتیاز باقی نہیں رہ سکتا۔

ملک کی تعمیر وترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ غیر ضروری ذہنی انتشار، بدگمانی اور خوف کی فضا ختم کی جائے، کوئی ملک اس طرح ترقی نہیں کرسکتا کہ اس کی آبادی کے مختلف عناصر میں اپنے مستقبل کے بارہ میں اپنے عقائد اور اس آئین، ضوابط اور ہدایات کے بارہ میں جن کے مطابق ان کو زندگی گزارنا ضروری ہے شکوک وشبہات ہوں، اور اس سے بڑھ کر ملک کے لئے

بدخواہی نہیں ہوسکتی کہ وہ توانائی جو ملک کی سالمیت، اس کی حفاظت اور تعمیر وترقی میں صرف ہونی چاہئے تھی، وہ شکوک وشبہات کو رفع کرنے میں یا شکوک وشبہات کی فضا میں زندگی گزارنے میں خرچ ہو، میں ایک قدم آگے بڑھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہم اس اندیشہ میں مبتلا ہیں کہ ہماری آئندہ نسل ہماری طرح ان چیزوں کی معتقد اوران پر یقین کرنے والی نہیں جن پر ہم اعتقاد رکھتے ہیں اور جو ہمارے لئے ضروری ہیں تو مسلمانوں کے اندر ایک تذبذب اور اندرونی انتشار کی وہ کیفیت پیدا ہوگی جو صرف مسلمانوں کے لئے مضر نہیں ملک کے لئے بھی مضر ہے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ دین اسلام کے دائرہ کو سمجھ لیا جائے، اس بارہ میں مذاہب میں خود اختلاف ہے اور اس میں درجوں کا فرق ہے کئی مذاہب ایسے ہیں کہ وحی ونبوت سے ان کا آغاز ہونے کے باوجود انہوں نے مذہبی زندگی کو ایک خاص دائرہ میں محدود کرلیا ہے، مثلاً عبادات کے دائرہ میں۔ لیکن اسلام کا معاملہ یہ نہیں ہے، اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے، یہ ایک اساسی حقیقت ہے، جو عبد ومعبود کے تعلق کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی، ہر مسلمان خدا کا فرمانبردار بندہ ہے اور اس کا تعلق خدا سے دائمی ہے، عمومی ہے، عمیق بھی ہے اور وسیع اور جامع بھی، قرآن شریف میں ہے:۔

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ص وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ط اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ". (سورة البقرة:۲۰۸)

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ، اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔

ان دو حقیقتوں کو اگر سمجھ لیا جائے کہ یہ دین ہمیں وحی سے ملا ہے نیز یہ کہ پیغمبر کو بھی اس پر عمل کرنے کا حکم ہے، قرآن مجید میں صاف صاف آتا ہے:۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ. (سورة الجاثية۔۱۸)

(اے پیغمبر) ہم نے آپ کو دین کے خاص طریقہ (شریعت) پر کردیا ہے، تو آپ اسی پر چلتے جائیے اور بے علموں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے۔

نبی معصوم اور نبی محبوب سے یہ کہا جا رہا ہے، تو ہم سے کیسے مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم شریعت کو بدل دیں۔

یہ دو حقیقتیں ہیں جن کو سمجھنے کے بعد اس غلط فہمی کا پردہ ہی چاک ہو جاتا ہے، اور ایک غیر ضروری صورت حال کا مقابلہ کرنے اور اس پر اپنی ذہانت وتوانائی صرف کرنے سے ہمیں چھٹی مل جاتی ہے اور ملک وحکومت کو دوسرے ضروری کاموں کے لئے وقت بچ جاتا ہے۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی وحدت کے لئے سالمیت کے لئے اور مشترک وطنی شعور کے لئے ضروری ہے کہ ایک مشترکہ واحد عائلی قانون(Uniform Civil Code)نافذ ہو، تو میں ایک سیدھی سی بات پوچھتا ہوں، اسکول کا بچہ بھی اس کا جواب دے سکتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم جو ہوئی تھی وہ اصلاً وابتداءً برطانیہ اور جرمنی کے دمیان ہوئی تھی، جرمن اور انگریز دونوں نہ صرف یہ کہ کرسچین ہیں پروٹسٹنٹ بھی ہیں اور ان کا عائلی قانون بالکل ایک ہے، یہ کوئی بھی شخص معلوم کر سکتا ہے کہ جہاں تک عیسائی قانون کا تعلق ہے، ایک ہے، پھر یہ دونوں دشمنوں کی طرح کیوں لڑے؟ اگر یونی فارم سول کوڈ جنگ کو روک سکتا ہے اور نبرد آزمائی اور تصادم سے باز رکھ سکتا ہے تو اس کو وہاں روکنا چاہئے تھا، پھر دوسری جنگ عظیم کا بھی یہی حال تھا کہ کرسچین اور پروٹسٹنٹ جن کی تہذیب بھی، عائلی قانون بھی، بلکہ معاشرت بھی ایک ہے، وہ اس طرح سے لڑے جیسے ایک دوسرے کو خون کے پیاسے ہوں، آپ عدالتوں میں بھی جا کر دیکھ آیئے کہ جو مقدمے آتے ہیں، مسلمان مسلمان کے خلاف اور ہندو ہندو کے خلاف مدعی ہے، اور مدعا علیہ کی عزت کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے، اس کے گھر پر ہل چلا دینا چاہتا ہے، ان دونوں کا عائلی قانون بھی ایک ہے، بعض اوقات تو خون بھی ایک ہوتا ہے، دونوں فریق ایک نسل، ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، درحقیقت اختلافات اور دشمنیوں کا تعلق نفسانیت سے ہے، دولت پرستی کے جنون سے ہے، نفس پرستی اور مادیت سے ہے، اس غلط نظام اور نصاب تعلیم سے ہے جس نے اخلاقیات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے، اس کا تعلق ہرگز عائلی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے، یہ میں ڈنکے کے چوٹ پر کہتا ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ عائلی قانون ایک ہو جانے سے اخلاقی صورت حال میں قطعاً ایک ذرہ کا فرق نہیں پڑے گا، پھر کیوں بار بار اس کا

حوالہ دیا جاتا ہے کہ یونی فارم سول کوڈ ہونا چاہئے تاکہ آپس میں اتحاد والفت پیدا ہو۔

اس موقع پر ایک مشہور برطانوی ماہر قانون بوڈن ہیمر (E Boden Heimer) نے فلسفۂ قانون اور اس کی سماجی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ ہماری آنکھ کھولنے اور حقیقت پسندی سے کام لینے کے لیے کافی ہے، وہ کہتا ہے:۔

''کسی قانون نظام سے جس کا منشا زندگی میں یکسانیت پیدا کرنا ہو اگر لوگوں کے ایک بڑے طبقہ میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے تو اس قانون کو ٹوٹنے یا اس سے بچنے سے محفوظ رکھنا حکومت کے ذمہ داروں کے لئے انتہائی مشکل ہوگا، لوگ کسی ایسے قانون کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکتے جسے وہ نامناسب یا ناقابل برداشت سمجھتے ہوں، جو حکومت اس قسم کے نظام قانون کو برقرار رکھنے پر مصر ہو اسے اس کے نافذ کرنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس لئے کوئی نظام جس کی بنیاد انصاف پر نہ ہو غیر محفوظ اور پر خطر ہوگا جیسا کہ جان ڈکنسن نے کہا ہے:۔

''ہمیں کسی عام اور متعین ضابطہ کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایسے ضابطہ کی ہے، جس کی بنیاد انسانی ضرورت اور صلاحیت پر ہو، ورنہ وہ نظام قابل عمل نہ ہوگا، یہ قانون منصفانہ اقدار اور اندرونی رجحانات کی خلاف ورزی کرے گا، ہمیشہ اس کی خلاف ورزی کی جائے گی''

اور وہ اتنا ناپائیدار ہوگا کہ اس کا جواز ہی ختم ہو جائے گا(۱)''۔

پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یکسانی اور اتحاد پیدا کرنے کے لئے اگر کوئی قانون کسی آبادی کے کسی عنصر، ملک کے کسی فرقہ اور کسی مذہب کے ماننے والوں کے بنیادی عقائد سے متصادم ہے، تو وہ اتحاد، باہمی تعاون، ملک کی تعمیر وترقی میں گرم جوشی، خلوص اور سکون ومسرت کا احساس پیدا کرنے کے بجائے مزید انتشار، بے دلی یا نیم دلی بلکہ مجبوری اور غلامی کا وہ احساس پیدا کر سکتا ہے جو کسی آزاد ملک یا متحدہ قومیت کے لئے جذام اور کوڑھ سے کم نہیں۔

E Boden Heimer Juris Prudence Harvard, 1967. P.212(۱)

حضرات!

یہ دین جو ہم تک پہنچا ہے اور جس دولت کے ہم اور آپ امین ہیں، اور (محافظ کا لفظ تو بڑا ہے) اس دولت کے حامل ہیں، وہ دین ہمیں دانشوروں، سماجی خدمت گاروں، اصلاحی کام کرنے والوں (Social Workers) اور بانیان سلطنت کے ذریعہ نہیں پہنچا، یہ سارے گروہ قابل احترام ہیں، لیکن ''دین'' اور تہذیب، نظام فکر، مکتب خیال (School of Thought) اور خالص مطالعہ، غور وفکر اور تجربہ کے نتائج میں ایک حد فاصل، سرحدی لکیر (Line Of Demarcation) ہوتی ہے، جو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے، اس خط کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، حد فاصل یہ ہے کہ آسمانی مذاہب (ادیان) ان برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہنچے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا، اور جن پر وحی آتی تھی، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے خلط مبحث (Confusion) ہوتا ہے، زیادہ تر لوگ نادانستہ طریقہ پر ان مذاہب سے توقع اور بعض اوقات آگے بڑھ کر ایسی چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں، جن کی ان مذاہب میں گنجائش اور ان کا کوئی جواز نہیں، وہ بعض اوقات ان کی تشریح کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے ہیں (۱)، اپنی وسعت مطالعہ اور وسعت نظر کے اظہار کے لئے وہ مذاہب کی ترجمانی ایسی کرنے لگتے ہیں جیسے کہ یہ نرے فلسفے یا انسانوں کے بنائے ہوئے تہذیب وتمدن کے نظام اور سماجی تجربے اور معاشرتی نظریات ہیں۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے ایمان وعقیدہ کا جزء ہے کہ ان کا عائلی قانون (Family Law) اسی خدا کا بنایا ہوا ہے، جس نے قرآن اتارا اور عقائد وعبادات کا قانون عطا کیا، سارا قرآن مجید ان تصریحات سے بھرا ہوا ہے، مسلمان اس عقیدہ پر ایمان لانے پر مجبور ہیں، اور اس کے بغیر وہ مسلمان نہیں رہ سکتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون خدائے علیم وخبیر کا بنایا ہوا ہے، جو انسان کا بھی خالق ہے اور اس کائنات کا بھی اور جو اس کی فطری ضرورتوں اور کمزوریوں دونوں سے واقف ہے، وہ فرماتا ہے:-

---

(۱) جیسا کہ شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ میں قرآنی لفظ واصطلاح ''متاع'' کی تشریح میں کیا گیا۔

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ. (سورۃ الملک۔ ۱۴) کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی) باریک بیں اور (پورا) باخبر ہے۔

اسی طرح وہ زمانہ کا بھی خالق ہے، ہمارے لحاظ سے ماضی حال و مستقبل کی تقسیم کتنی ہی صحیح اور ضروری ہو، اس کے لحاظ سے سب ماضی ہی ماضی ہے، اس لئے ایک بار مان لینے کے بعد کہ وہ خدا کا بنایا ہوا قانون ہے، جو ایک زندہ جاوید امت اور ایک عالمگیر اور دائمی شریعت کے لئے بنایا گیا ہے تو ترمیم اور تبدیلی کی ضرورت کا مطالبہ ایک کھلے منطقی تضاد (اور جہاں تک مسلمان کہلانے والے اشخاص کا تعلق ہے) ایک اعتقادی اور عملی نفاق کے سوا کچھ نہیں۔

پھر معاملہ صرف ایمان بالغیب اور مذہبی عقیدت اور عصبیت کا نہیں، اس قانون کے مکمل، متوازن اور عادل ہونے اور زمان و مکان کی تبدیلی پر حاوی ہونے کی عقلی و علمی شواہد، اور مسلم و غیر مسلم، مشرقی و مغربی فضلاء، جری و انصاف پسند مقننین کے واضح اعترافات اور عملی تجربے اتنے ہیں کہ کوئی ''شپرہ چشم'' ہی ان سے انکار کر سکتا ہے، اس موضوع پر متعدد نامور فضلاء نے قلم اٹھایا ہے، اور بڑا قیمتی مواد جمع کر دیا ہے۔

حضرات! شاہ بانو کیس کا سپریم کورٹ سے فیصلہ صادر ہونے کے موقع پر ہندوستان کی ملت اسلامیہ نے اپنے دین و شریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری اور ملّی غیرت و خودداری کا ایسا ثبوت دیا جس کی نظیر عرصۂ دراز سے ملّی و دینی تحریکات کی تاریخ میں دیکھنے میں نہیں آئی، ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عظیم الشان جلسے ہوئے، بعض اضلاع اور چھوٹے مقامات میں بھی ایک ایک لاکھ سے زیادہ کا مجمع تھا، کلکتہ کے جلسۂ عام میں جو ۷؍اپریل ۱۹۸۵ء کو شہید مینار میدان میں منعقد ہوا تھا محتاط اندازہ کے مطابق پانچ لاکھ (نصف ملین) انسان تھے، شمالی ہند سے جنوبی ہند کے آخری سرے، کشمیر کی فلک بوس چوٹی سے جنوب میں کنیا کماری تک جلسوں کا ایک طوفان امنڈ پڑا، جس میں بورڈ کے ذمہ دار ارکان اور ملک کے ممتاز ترین علماء بذات خود شریک تھے، اس کے علاوہ وزیر اعظم ہند مسٹر راجیو جی اور وزیر قانون کے نام ہزاروں کی تعداد احتجاجی تار اور جلسوں کی تجویزیں بھیجی گئیں۔

اس ملک گیر عوامی احتجاج اور عظیم الشان جلسوں کے ساتھ (جس میں نظم و احترام قانون، سنجیدگی اور وقار کا پورا لحاظ رکھا گیا) بورڈ کے ذمہ داروں نے وزیر اعظم ہند راجیو جی سے اور ان کے اشارہ و ہدایت سے جمہوریۂ ہند کے وزیر قانون مسٹر اشوک سین اور ان کے رفقاء سے رابطہ قائم رکھا، انہوں نے راجیو جی سے دو تین مرتبہ شخصی اور خصوصی ملاقاتیں کیں اور آزادانہ و بے تکلفانہ فضا میں ان کو مسئلہ کو نوعیت و اہمیت، مذہبی و شرعی نقطۂ نظر اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے جذبات و تاثرات سے واقف کرانے کی مخلصانہ کوشش کی، راجیو جی نے بھی (جن کو یقیناً اس سلسلہ میں مسلمانوں کے اضطراب و بے چینی اور عظیم الشان جلسوں کی رپورٹ پہنچ چکی ہوگی) صبر و سکون اور احترام کے ساتھ یہ بات سنی اور وہ اس بارہ میں مطمئن (Convincbd) ہو گئے کہ یہ مسلمانوں کا خالص مذہبی مسئلہ ہے، اور اس کی ترجمانی وہی علماء کر سکتے ہیں، جن کا دین کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہے اور وہ مسلمانوں کے نزدیک دین و شریعت کے صحیح ترجمان ہیں، اور اس سے کوئی سیاسی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے، چنانچہ انہوں نے ایک سے زائد بار اس کا اظہار کیا کہ انہوں نے اس مسئلہ پر نامور علماء سے تبادلۂ خیال کر لیا اور وہ مطمئن ہیں کہ اسلام طبقۂ اناث (Female Sex) بشمول مطلقہ خواتین کے حقوق کا پورا تحفظ کرتا ہے، اس سلسلہ میں یہاں تک ان کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ وہ موجودہ قانون سے بھی زیادہ ان کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے، اور ان کو حق دیتا ہے، وہ حقیقت پسندی، اخلاقی جرأت، اور احساس ذمہ داری اور عزم و فیصلہ کے ساتھ مطلقہ خواتین کے حقوق کے تحفظ کا بل پارلیمنٹ میں لائے اور اس پر واضح اور طاقتور وہپ (Whip) جاری کیا، اور وہ ۶ رمئی ۱۹۸۶ء کو (تحفظ حقوق مسلم مطلقہ بل) کے عنوان سے کھلی اکثریت کے ساتھ پاس ہوا اور مسلمانوں نے ایک ایسی ملت کی طرح جو صحیح و غلط تائید و مخالفت اور خلوص و سیاست میں فرق کرنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوئی، اس شریفانہ اور جرأت مندانہ اقدام کا پوری فراخ دلی اور جذبۂ شرافت کے ساتھ اعتراف اور اپنے تشکر و امتنان کا اظہار کیا۔

اب ضروری کام یہ ہے کہ وزارت قانون یا سپریم کورٹ کے ذریعہ عدالتوں کو یہ

اطلاع دے دی جائے کہ مسلم مطلقہ کے معاملہ میں اب زندہ، فعال اور نافذ العمل دفعہ ''مسلم مطلقہ کے حقوق کے تحفظ'' کا (ترمیم شدہ شکل میں) یہ نیا بل ہے، جو ۶ رمئی ۱۹۸۶ءکو پارلیمنٹ نے پاس کیا، اس لئے کہ یہ دیکھا جارہا ہے کہ عدالتیں اس بل سے تجاہل عارفانہ برتتی ہیں، یا اس کو نظر انداز کر کے دفعہ ۱۲۵ ہی کے مطابق فیصلہ کررہی ہیں جیسا کہ گجرات اور کیرالہ وغیرہ کے ہائی کورٹ کے فیصلہ سے ظاہر ہوتا ہے، دوسرے اس حقیقت کا بھی اظہار ہوا ہے کہ وہ وکلاء اور ایڈوکیٹ جو طلاق دینے والے فریق (مرد) کی طرف سے بحث کرتے ہیں، وہ یا تو اس بل سے سرے سے ناواقف ہیں یا وہ اس کو نافذ العمل ثابت کرنے کے لئے دلائل پیش کرنے اور کامیاب بحث کرنے میں پہلو تہی کرتے ہیں، اور اس کی صحیح وکالت نہیں کرتے، اس لئے ملک کے قانون داں طبقہ کو بھی (خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں) صحیح معلومات فراہم کرنا اور ان کو صحیح صورت حال سے واقف کرنا ضروری ہے اور بورڈ کو اس سلسلہ میں علمی اور قانونی طور سے اس طبقہ کو (اگر رہنمائی کا لفظ اس کے شایان شان نہیں) مواد مہیا کرنے اور فیڈ (Feed) کرنے کی ضرورت ہے ورنہ تجاہل اور تغافل کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا، اور یہ پاس شدہ بل اوراق کی زینت بن کر رہ جائے گا، بورڈ کا ایک موقر وفد وی پی سنگھ جی کے زمانۂ وزارت عظمیٰ میں ان سے ملا تھا، اور ان کے اس سلسلہ میں حکومت کی ذمہ داری اور ادائے فرض کی طرف متوجہ کیا تھا، اور انہوں نے اس کا وعدہ کیا تھا، ضرورت ہے کہ یہ کوشش اور سلسلۂ جنبانی جاری رہے، اور اس کو ایک مہم کی طرح چلایا جائے۔

حضرات! میں چند لفظ اپنے ان غیر مسلم برادران وطن، دانشوروں اور صحافیوں سے بھی کہنا چاہتا ہوں، جنہوں نے شاہ بانو کیس کے فیصلہ پر مسلمانوں کا شدید ردعمل ظاہر ہونے اور پارلیمنٹ میں مسلم مطلقہ خاتون کے بارہ میں بل پیش ہونے اور پھر اس کے اکثریت کے ساتھ منظور ہونے پر اپنے شدید ردعمل، تلخ تنقید وتبصرہ اور حیرت واستعجاب کا مظاہرکیا اور اس کو طبقۂ نسواں کے حق میں شدید ناانصافی قرار دیا۔

اس سلسلہ میں ایک حقیقت تو یہ پیش نظر رہنی چاہئے کہ مسلم معاشرہ اور ہمارے ملک کے غیر مسلم معاشرے، سماج، خاندانی زندگی اور ماحول اور اسی کے ساتھ دونوں فرقوں کے مذہبی

قانون وآئین میں ایک فرق ہے، جس کوملحوظ رکھنا چاہئے، وہ یہ کہ اسلام اور مسلمانوں میں عورت کی شادی ہوجانے کے بعد وہ اپنے خاندان، والدین اور بھائیوں سے کٹ نہیں جاتی اور نکاح وطلاق دونوں حالتوں میں خاندان کے ایک ایک فرد ماں باپ (اگر وہ زندہ ہیں) کی بیٹی اور بھائی بہنوں کی بہن ہوتی ہے، وہ ترکہ (Heritage) اور جائداد میں اس پورے حصہ کی مستحق ہوتی ہے جو شریعت اسلامی نے مقرر کردیا ہے، اور جس کا قرآن مجید میں ذکر اور اس کے دینے کی تاکید ہے اور وہ شرعاً وقانوناً اس کا مطالبہ کرسکتی ہے اور شرعی عدالت اس کے حق میں فیصلہ کرے گی، اس کے خلاف جو عمل کیا جائے گا، وہ گناہ اور شریعت میں مداخلت بلکہ اس سے بغاوت ہوگی۔

اس کے برخلاف (معذرت کے ساتھ کہا جاتا ہے) ہندو معاشرہ اور سماج میں عورت شادی کے بعد اپنے خاندان، ماں باپ اور بھائی بہنوں سے کٹ جاتی ہے، اس کی کفالت کی ذمہ داری سرتاسر شوہر پر عائد ہوتی ہے، اسی صورت حال اور سماجی ڈھانچہ کی وجہ سے شوہر کے انتقال پر عورت بالکل لاوارث اور تنہا ہوجاتی ہے، اس کی کفالت، سکونت وحفاظت کی ذمہ داری کسی طرح اس کے خاندان (میکہ) پر عائد نہیں ہوتی اور اس کے لئے عزت کے ساتھ زندگی گزارنا ناممکن ہوجاتا ہے، اسی صورت حال اور رواج نے قدیم زمانہ میں (جس کی تاریخی تحدید مشکل ہے) خواتین کے طبقہ کو جو بیوگی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھیں، ستی کی رسم کی طرف مائل کیا، جو اس کسم پرسی اور لاوارثیت سے نجات پانے کا واحد راستہ نظر آتا تھا، اور صدیوں بلکہ شاید ہزاروں برس سے اس ملک میں یہ رسم جاری تھی اور یہ شریف اور معزز گھرانوں کی ایک روایت اور قابل تقلید بلکہ قابل فخر عمل بن گیا، مسلمانوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں مذہب میں مداخلت کے الزام سے بچنے کے لیے اس کو قانوناً منسوخ اور ممنوع قرار نہیں دیا لیکن جیسا کہ ڈاکٹر برنیر (Burnier) نے اپنے ''سفر نامۂ ہند بعہد سلطنت مغلیہ'' میں لکھا ہے کہ حکمراں اور بااثر طبقہ کی بیگمات ان گھرانوں میں جاتی تھیں اور بیوہ کو ستی ہونے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی تھیں۔(۱) برطانوی حکومت نے

---

(۱) وقائع سیر وسیاحت ڈاکٹر برنیر جلد دوم، ص:۱۷۲۔ Francois Burnier Travels in the Mogul Empire PP. 306-7

اس کو یکسر ممنوع قرار دیا، لیکن اب بھی کہیں کہیں (خاص طور پر راجپوتانہ میں) یہ رسم جاری ہے، اور اس کے واقعات سننے میں آتے ہیں۔

اس فرق کی نشاندہی کے علاوہ جو ضرورتاً اختیار کی گئی اور جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمان مطلقہ خاتون طلاق کے بعد یکسر لاوارث نہیں ہوجاتی، اور وہ بھیک مانگنے یا زندگی کا خاتمہ کرنے پر مجبور نہیں ہوتی، وہ اپنے ان اہل خاندان اور خونی رشتہ رکھنے والوں کے پاس عزت کی زندگی گزار سکتی ہے، اس حقیقت کی طرف ادب کے ساتھ ان معترضین وناقدین کو متوجہ کرنا ہے کہ اس مسئلہ سے کہیں زیادہ ان کی توجہ کی مستحق خود ان کے فرقہ اور طبقۂ نسواں کی سیکڑوں، ہزاروں نئی بیاہی دلہنوں کے جلائے جانے، یا غیر طبعی طور پر ان کو ہلاک کر دینے کے وہ واقعات ہیں جن سے شاید اس لمبے چوڑے ملک میں کوئی دن خالی جاتا ہو۔

یہ اس احساس تناسب (Sense Of Proportion) کے بھی خلاف ہے، جس پر زندگی کا نظام چل رہا ہے، مسئلہ جس نسبت سے توجہ، فکر وپریشانی کا مستحق ہے، اسی نسبت سے اس کی طرف توجہ اور اس میں توانائی صرف کرنے کی ضرورت ہے، رائی کا پربت بنانا، نہ عقل سلیم کا تقاضا ہے، نہ عقل عملی (Practical Wisdom) کا۔

برادران ملت!

اب میں اس مجمع کو ایمانی وقرآنی زبان میں خطاب کرنا چاہتا ہوں، اور آپ کی عملی زندگی کا محاسبہ کرتا ہوں، آپ دیکھئے کہ آپ اسلامی وقرآنی قانون معاشرت کا خود کتنا احترام کرتے ہیں، اس پر خاندانی روایات کو اور رسم ورواج کو کتنی ترجیح دیتے ہیں؟ اس پر اس کا اضافہ کیجئے جو آپ نے اپنے ہم وطنوں سے سیکھا ہے، جہیز کا بڑھا چڑھا مطالبہ ہم میں کہاں سے آیا؟ اس کو کسی نام سے یاد کیا جاتا ہو، یہ چیز کہاں سے آئی؟ مکہ ومدینہ، حرمین شریفین سے آئی ہے؟ قرآن مجید کے راستہ سے آئی ہے، یہ لعنت کہاں سے آئی؟ جب آپ اس کو قبول کرتے ہیں، تو بطور سزا کے آپ کی غیرت ملیّ کو، آپ کے وجود ملیّ کو بار بار نشانہ بنایا جاتا ہے۔

لیکن جب ہم اہل حکومت اور برادران وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ

سے شکایت کرنے کا حق کیوں نہ ہو؟ ان سے تو شکایت کریں گے اور ان کا دامن پکڑیں گے لیکن آپ کا گریبان پکڑ لیں گے، اور وہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہوگا، وہ دینی احتساب کا ہاتھ ہوگا، وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا، جو آپ کا گریبان پکڑے گا اور کہے گا کہ پہلے تم اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھو کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو تمہاری نگاہوں میں اس قانون کی کتنی حرمت ہے؟ تم جہاں اس قانون کو چلا سکتے ہو وہاں چلا رہے ہو کہ نہیں؟ تم تو اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے قانون کو چلائے، اس کا احترام کرے؟

یہاں سے یہ عہد کر کے جایئے کہ اب قانون شریعت پر آپ چلیں گے، یہ جہیز کی کیا مصیبت ہے؟ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کئے جاتے ہیں، ان کے پورا نہ ہونے پر یہ معصوم لڑکیاں جلا دی جاتی ہیں، ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں، صرف دہلی میں ہر بارہ گھنٹے پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے(۱) کیا اس کائنات کے خالق اور نوع انسانی کے مربی (جس کی مخلوق مرد و عورت دونوں ہیں) کو یہ چیز گوارہ ہو سکتی ہے؟ کیا اس ظلم کے ساتھ کوئی ملک، کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے، خدا کی رحمت و نصرت کا مستحق ہو سکتا ہے؟ آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں آپ کے ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی ہمت نہیں ہونی چاہئے تھی، میں نے دہلی ہی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

”وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيهِمْ، وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ“. (سورۃ الانفال:۳۳) اور خدا ایسا نہ تھا جب تک تم ان میں تھے انہیں عذاب دیتا اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور انہیں عذاب دے۔

آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہندوستانی سماج میں، ہندوستان کے معاشرہ اور سوسائٹی میں یہ ظلم ہو، اس کو عقل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، آپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں ہونا چاہئے تھا، چہ جائے کہ آپ کے ہاتھوں ہو، عہد

(۱) ”قومی آواز“ دہلی، ۱۰؍جون ۱۹۸۴ء

کیجئے کہ آپ اسلامی طریقہ پر، شریفانہ انسانی طریقہ پر شادی کا پیام دیں گے، آپ لڑکی مانگیں گے، اپنے لئے رفیقۂ حیات کی تلاش کریں گے، بیٹے کے لئے پیام دیں گے، جہیز کے لئے آپ کے بڑھے چڑھے مطالبات نہیں ہوں گے کہ ہمیں یہ ملنا چاہئے، وہ ملنا چاہئے، لڑکوں کو اوران کے وارثوں اور بزرگوں کو اس کا عہد کرنا چاہئے کہ ہم اپنے یہاں تو کیا ہم اس ملک سے اس رسم کو ختم کردیں گے۔

ایسے ہی ترکہ شرعی طریقہ پر تقسیم ہونا چاہئے، نکاح شرعی طریقہ پر ہونا چاہئے ....اور طلاق کا مسنون طریقہ معلوم کرنا چاہئے، مسنون اور افضل طریقہ کیا ہے، پھر اس کے بعد فقہی طلاق جس سے طلاق واقع ہوجاتی ہے، اس کو سمجھنا چاہئے کہ طلاق رجعی کیا ہوتی ہے؟ طلاق بائن مغلظہ کیا ہوتی ہے؟ پھر آپ یہ بھی سمجھیں کہ طلاق ابغض المباحات ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جائز ہے، لیکن آخری درجہ کی چیز ہے، بڑی مجبوری کی چیز ہے، جو اپنے کو حرام چیزوں سے اور زندگی کو تلخ بننے سے بچانے کے لئے بہت مجبوری سے دل پر پتھر رکھ کر اختیار کی جاتی ہے، یہ نہیں کہ طلاق ایک فیشن ہوگیا ہے، جو لوگ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے ہیں، اس میں تھوڑی سی ہماری کوتاہی کو بھی دخل ہے، جتنا طعنہ دیتے ہیں اتنے کے مستحق تو ہم ہرگز نہیں ہیں (۱)۔

حاضرین کرام!

آپ اجازت دیں کہ عدالت وحکومت اور آئین ساز ادارہ وانتظامیہ پر اظہار خیال کرنے کے ساتھ اپنی ملت کا بھی ناقدانہ، لیکن منصفانہ وحقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے، ایک اہم چیز جو عالم غیب میں بھی بڑا اثر رکھتی ہے، اور ملّی واجتماعی زندگی میں بھی اس کے اثرات بڑے وسیع اور دوررس ہیں، وہ مسلمانوں کا اپنے ذاتی معاملات پر اور اپنی دلچسپی کے دائرہ میں اسراف وفضول خرچی، شہرت وعزت کے حصول یا رسم ورواج کی پابندی میں بے دریغ روپیہ صرف کرنا اور اپنے پڑوسیوں، عزیزوں اور ملت کے دوسرے افراد کے فقر وفاقہ، اضطرار واضطراب اور ان افسوسناک

---

(۱) مسلمانوں میں طلاق کی شرح وہ نہیں ہے جو بیان کی جاتی ہے اس میں مبالغہ اور رنگ آمیزی سے کام لیا جاتا ہے، پھر بھی تھوڑی سی بے اعتدالی ضرور ہے۔

حالات سے چشم پوشی اور بے حسی ہے، جن میں کم سے کم انقلاب کے بعد مسلمان اس ملک میں مبتلا ہو گئے ہیں، فقہ وفتاویٰ کی محتاط ومحدود زبان اور حلال وحرام کے معین حدود واحکام میں خواہ اس کے لئے حرمت کا کوئی صریح فتویٰ اور لرزہ خیز لفظ نہ ملے، اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ صورت حال اللہ تعالیٰ کی حکیم وعادل ذات اور ربوبیت اور رحمت عامہ صفات کے لیے غضب اور سخت ناپسندیدگی کا باعث ہے کہ ایک ایسے ماحول وزمانہ میں جہاں ایک کثیر تعداد نان شبینہ کی محتاج ہو، جاں بلب مریض دوا اور برہنہ تن شریف مرد اور عورتیں ستر پوشی سے محروم ہوں کہیں کسی بیوہ کے چولھے پر توا اور کہیں کسی غریب کے جھونپڑے میں دیا نہ ہو ایک ایک دعوت اور ایک ایک تقریب میں ہزاروں لاکھوں روپے بے دریغ خرچ کیے جائیں۔

زمانہ کے بہت سے تغیرات وانقلابات اور علم وترقی کے باوجود مسرفانہ اور ''شاہانہ'' شادیوں اور تقریبوں کا رواج بند نہیں ہوا، البتہ بعض جگہ انہوں نے جدید (ماڈرن) طرز اختیار کر لیا ہے، اور سیاسی مصالح ومقاصد بھی کہیں کہیں ان سے وابستہ ہو گئے ہیں، آج بھی ہماری بہت سی برادریوں اور تجارت پیشہ حلقوں اور عمائد شہر میں تقریبات پر (جو ایک انسانی ضرورت اور دینی فریضہ تھا) دل کھول کر اور جان پر کھیل کر روپیہ خرچ کرنے کا رواج ہے، ان میں سے بہت سے حضرات اپنی دوسری عملی زندگی میں دیندار اور صاحب خیر بھی ہیں مگر انہوں نے اس شعبہ کو دین سے بالکل غیر متعلق سمجھ رکھا ہے۔

حقیقتاً اس سلسلہ میں سخت قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، ان فرائض وتقریبات کا تخیل ومفہوم یکسر بدلنے کی ضرورت ہے، اس کے خلاف اعلان جنگ اور اعلان بغاوت کی ضرورت ہے، اس بات کو صاف طریقہ پر واضح کر دینے کی ضرورت ہے کہ یہ مسرفانہ تقریبات افراد کے لئے غضب الٰہی کا موجب اور ملت کے لئے وبال وادبار کا باعث ہیں، اللہ تعالیٰ کی رحیم وحکیم ذات اور اس کی حکیمانہ شریعت ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ جھوٹے نام ونمود اور عارضی رونق وزینت یا کام ودہن کی فانی لذت پر وہ دولت صرف کی جائے جو سیکڑوں ضرورت مندوں کے کام آ سکتی تھی۔

خوش حال وسر برآوردہ مسلمانوں کے سامنے یہ واقعہ آنا چاہئے کہ مدینۂ منورہ کی محدود ومختصر آبادی میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نکاح کرتے ہیں، اور اس ذات گرامی کو اطلاع بھی نہیں ہوتی جس کی شرکت وموجودگی ہر بزم کے لئے باعث فخر وزینت تھی، خصوصاً ایک جلیل القدر صحابی اور مہاجر کے کاشانہ کا چراغ بجا طور پر تھی، جس نے ابھی ابھی اس نئے شہر میں قدم رکھا تھا، اور جس کے سارے تعلقات اسی مہاجر برادری سے قائم تھے، اور یہاں کی رونق وبرکت سب اسی ذات عالی کے طفیل تھی، جس سے ازواجی زندگی کا یہ طریقہ اور اس کے یہ احکام معلوم ہوئے تھے، آج دور دراز کے عزیزوں اور دوستوں کو یہاں تک کہ ان ملکوں سے جہاں پاسپورٹ اور ویزا ہے مدعو کیا جاتا ہے، اور حضرت عبدالرحمٰنؓ کی شادی کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وآلہ وسلم کو اس وقت ہوتی ہے، جب ان کے کپڑوں پر خوشبو کا نشان ملاحظہ فرمایا جاتا ہے، پوچھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شادی کرلی ہے، اس وقت برکت کی دعا کی جاتی ہے، اور ولیمہ کے لئے ہدایت ہوتی ہے خواہ ایک بکری ہی ذبح کرکے ہو(۱)۔

اب وقت آگیا ہے کہ ان ''حوصلہ مندیوں'' پر جن کا ان مواقع پر اظہار کیا جاتا ہے، ہمارا ذمہ دار طبقہ اپنی پوری ناپسندیدگی اور بیزاری کا اظہار کرے، ان حوصلہ مند حضرات کو بھی سوچنا چاہئے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات، مسلمانوں کی معاشی پستی اور بدحالی بلکہ فلاکت اور ہلاکت کے دور میں اس کی کیا گنجائش ہے کہ کوئی فرد اپنے یہاں کہ کسی ایک تقریب پر اتنے مصارف کردے جس سے ایک برادری کی پرورش یا مکمل ادارہ کا انصرام ہوسکتا ہے؟ ان کو آخرت کے مؤاخذہ اور حساب سے بھی ڈرنا چاہئے جب ایک ایک پائی کا حساب دینا ہوگا اور افراد وملت کی شدید ضرورت کی موجودگی میں اس دریادلی کا جواز پیش کرنا ہوگا جو اپنی ذات تک محدود تھی، اور جس نے محض نام ونمود یا اپنی حیثیت عرفی کا مظاہرہ اور بعض اوقات اس کو ترقی دینا، اس کی توسیع اور اس سے اجتماعی یا سیاسی فوائد حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔

حضرات!

اس طویل سمع خراشی کے بعد اور اس کے ساتھ یہ ناچیز یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ

---

(۱) ملاحظہ ہو صحیح مسلم، باب النکاح علی وزن نواۃ من ذہب۔

اس کی نیاز آگیں آنکھیں اس مؤقر مجمع میں اس شخصیت کے چہرہ کو تلاش کرتی ہیں، جس نے مسلم پرسنل لا میں مداخلت اور مسلمانوں کے دین وشریعت کے صریح احکام کے مطابق عائلی زندگی گزارنے کی نہ صرف دشواری بلکہ اس کے ناممکن ہو جانے کے خطرہ کو شدت کے ساتھ سب سے زیادہ اور بہت پہلے محسوس کیا، اوراس کے لئے اس کے اندر ایسی بے چینی اور اضطراب پیدا ہوا جس نے بالآخر پوری ملت کو اور ملک کے مسلمانوں کو اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کر دیا، ۱۹۷۲ء میں بورڈ کی تشکیل ہوئی اور اس سلسلہ میں وہ مہم اور تحریک چلی جس نے حکومت کو بھی سنجیدگی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا اور بالآخر ایکٹ پارلیمنٹ سے منظور ہوا جس کی مثالیں ملک کی آئینی وجمہوری زندگی میں کم ملتی ہیں، آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میری مراد کس محبوب شخصیت سے ہے، پھر بھی دل کو تھام کر عرض کرتا ہوں کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے بانی وروح رواں مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ سے ہے، جن کی ایسے بڑے اجلاس میں پہلی مرتبہ غیر موجودگی شدت سے محسوس کی جارہی ہے، اللہ تعالیٰ ان کے درجے بلند فرمائے اور پوری ملت کی طرف سے ان کو شایان شان جزا عطا فرمائے۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆☆

اصلاح معاشرہ کا کام اور دار القضاء کا قیام
دو اہم ملّی ضرورتیں

خطبہ صدارت

اجلاس یازدہم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

منعقدہ ۹، ۱۰/ اکتوبر ۱۹۹۳ء بمقام جے پور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین محمدؐ وآلہٖ وصحبہ أجمعین ومن تبعھم باحسان ودعا بدعوتھم الیٰ یوم الدین.

حضرات!

میں آپ سب حضرات کا خیر مقدم کرتے ہوئے جو ہندوستان میں امت مسلمہ اور شریعت اسلامی کے مختلف میدانوں میں اور مختلف سطح اور متفاوت درجات کے ساتھ نمائندگی کرتے ہیں، اور توفیق الٰہی کے مطابق دین اور علم کی اشاعت اور شریعت کی حمایت اور دفاع میں مشغول ہیں، اپنے اس احساس واعتراف اور تأثر کو چھپا نہیں سکتا کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا یہ اجلاس عام صحیح وقت کے ساتھ ایک مناسب، موزوں اور تاریخی ودینی اور شرعی اہمیت کے حامل مقام (جے پور) میں ہو رہا ہے، اس لیے کہ اس تاریخی شہر کے کچھ فاصلہ پر وہ شہر (ٹونک) واقع ہے جس کو یہ شرف حاصل ہے کہ تیرہویں صدی ہجری کے وسط میں وہاں شہادت گاہِ بالاکوٹ سے حامیان شریعت اور فدایان ملت کا وہ قافلہ منتقل ہوا، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے شہادت فی سبیل اللہ کے بجائے شہادت بالحق اور حمایت واشاعت شریعت کی سعادت مقدر فرمائی تھی۔

میری مراد تیرہویں صدی ہجری کے مجدد اور مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہیدؒ رائے بریلوی کے متعلقین اور افراد خاندان کا وہ مجموعہ ہے جو ان کے ہم رکاب اور ان کا ہمسفر تھا، نیز رفقائے سفر ہجرت وجہاد کے وہ عالی حوصلہ، قوی الایمانی اور باحمیت افراد جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے شہادت جسمانی کے بجائے شہادت ایمانی ولسانی اور شرعی ودینی زندگی کا عملی نمونہ دکھانے اور اس کو برت کر بتانے کی سعادت اور امکان کو ترجیح دی تھی اور جو اس آیت

کی تفسیر ہے:۔

"مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَاعَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ج فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ وَمَابَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا". (سورۃ الاحزاب:۲۳)

مومنوں میں کتنے ہی ایسے شخص ہیں کہ جو اقرار انھوں نے خدا سے کیا تھا اس کو سچ کر دکھایا، تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں جو انتظار کر رہے ہیں اور انھوں نے (اپنے قول) کو ذرا بھی نہیں بدلا۔

یہ قافلہ ٹونک کے قوی الایمان، صاحب حمیت وحمایت اسلامی، متشرّع والی ریاست نواب وزیر الدولہ مرحوم (متوفی ۱۲۸۱ھ-۱۸۶۴ء) جو سید صاحب کے مرید با اخلاص اور مُحبّ بااختصاص تھے، کی دعوت ہی نہیں بلکہ اصرار اور خوشامد پر ٹونک منتقل ہوا، جس کا بحیثیت ریاست کے کچھ ہی عرصہ پہلے قیام ہوا تھا، اور انھوں نے شہر کے جس حصہ میں قیام اختیار کیا اس کا نام ہی ان کی رعایت سے "قافلہ" پڑ گیا، اور آج بھی وہ اسی نام سے مشہور ہے۔

ان بقیّۃ السیف اور بقیۃ السلف مہاجرین ومجاہدین کی جنھوں نے ٹونک میں قیام اختیار کیا یہ خصوصیت تھی کہ وہ عقائد وفرائض وعبادات ہی ہیں، عادات واخلاق ومعاملات، شادی وغمی کی تقریبات اور روزمرّہ کی زندگی میں بھی متبع شریعت اور عامل بالسنّت تھے، اور ان رسوم وعادات سے جو غیر مسلموں کے اختلاط اور دین وشریعت سے ناواقفیت یا قدیم رسوم کی پابندی کی وجہ سے ہندوستان کے عام مسلمانوں میں رواج پکڑ چکی تھیں، اور انھوں نے اکثر مقامات پر شریعت کی جگہ لے لی تھی، نہ صرف محفوظ بلکہ بیزار وباغی تھے، اور ان کی زندگی اپنے پورے لوازم وتنوّعات کے ساتھ عہد سلف کی یاد تازہ کرتی تھی، اور یہ نتیجہ تھا، حضرات شہیدین (حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ) کی صحبت وتربیت کا۔

پھر اس ریاست کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ وہاں روز اوّل سے ریاستوں کے الغاو منسوخی کے آخری دن تک عدالتیں شریعت کے مطابق فیصلہ کرتی تھیں، اور وہاں شرعی قانون ہی نافذ تھا، جس کے ترجمان وشارح اور اس کی تنفیذ واجراء کا کام کرنے والے

جید علماء، فقہاء ومحدثین تھے۔

اس قربِ مکانی اور قابلِ فخر جوار کا لحاظ کرتے اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ کا یہ شعر پڑھنا ہر طرح موزوں اور برمحل معلوم ہوتا ہے ؂

آگ بجھی ہوئی اِدھر ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

اس قربِ مکانی اور اس پس منظر کے علاوہ یہ بھی اس اجلاس کے برمحل اور برموقع ہونے کی ایک دلیل اور فالِ نیک ہے کہ یہ اجلاس پہلی مرتبہ اس سرزمین پر ہو رہا ہے، جس کو اسلام کے اس مقبول، مؤثّر اور عہد آفریں و تاریخ ساز داعی اور مُربّی روحانی کے مرقد بننے کا شرف حاصل ہے، جس کو ہندوستان کے ایمانی و روحانی فاتح کا لقب دیا جا سکتا ہے، اور جس نے ہندوستان کی زمین، علاقے اور ملک کو اسلام کی تحویل میں لینے کے بجائے اس کا دل جیت لیا اور اس کے عقیدے، معاشرہ اور اخلاق پر سب سے زیادہ گہرا اثر ڈالا، اور اسلامی فتوحات کو حقیقی طور پر مؤثر، عمیق اور دائمی بنایا، میری مراد حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی ذات والا صفات سے ہے جن کا مرقد مبارک اس راجپوتانہ کی سرزمین کے ایک شہر اجمیر میں واقع ہے ؂

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

سامعین کرام وحاضرین ذوی الاحترام! اب میں اصل موضوع پر آتے ہوئے پہلے یہ عرض کروں گا کہ اسلام، اور دوسرے مذاہب، معاشروں اور نظامہائے زندگی کا ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام میں ازدواجی زندگی، مرد وعورت کا تعلق اور عائلی (Personal) رفاقت اور اس کی ذمہ داریاں، ان کے باہمی حقوق وفرائض، مذہب آسمانی اور شریعت خداوندی کا ایک شعبہ اور دین کا ایک جزء ہے، جس کے لیے آسمانی ہدایات، شرعی قوانین اور سنت رسولؐ رہنما اور نمونہ ہے، جب کہ دوسرے مذاہب اور دنیا

کے معاشروں اور تمدنوں میں وہ زندگی کی ایک ضرورت، ایک انسانی، نسلی اور تمدنی، کبھی اختیاری اور کبھی اضطراری اور کبھی (مجھے معاف کیا جائے) تفریحی اور التذاذی ضرورت ہے، اس بارہ میں اسلام کے امتیاز کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے صحیفۂ آسمانی میں طبقۂ اناث اور صنف ازواج کو ایک احسان اور مردوں کے لیے ذریعہ سکون اور مستحق مودّت ورحمت قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”وَمِنْ آيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ“. (سورة الروم: ۲۱)

(اور اس کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے اس نے تمہارے لیے تمہارے ہی جنس کی عورتیں پیدا کیں تا کہ ان کی طرف (مائل ہوکر) آرام حاصل کرو اور تم میں محبت ومہربانی پیدا کردی، جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لیے ان باتوں میں (بہت ہی) نشانیاں ہیں)۔

پھر اس حقیقت خلقت اور مظہرِ رحمت کے آسمانی اعلان کے ساتھ جس کا تعلق طبقۂ اناث اور ازدواجی زندگی سے ہے، نسل انسانی کے رہبرِ اعظم اور اسوۂ اعلیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایات اور آپ کی سیرت ونمونہ ہے، جس سے ازدواجی اور عائلی زندگی کے گزارنے کے لیے ہدایات ملتی ہیں، اور رفیقۂ حیات کا درجہ اور اس کا حق معلوم ہوتا ہے، اس سلسلہ میں چند احادیث پر اکتفا کی جاتی ہے:

”عن عائشة رضي الله عنها قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: خيركم خيركم لأهله وأنا خيركم لأهلي“. (۱)

(حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم میں سب سے بہتر ہوں)

سیرت اور اسوۂ نبوی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ”میں نے کسی کو اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر شفیق

(۱) ابن ماجہ باب حسن معاشرة النساء

ورحیم نہیں دیکھا''۔(۱)

عمرو بن الاحوص جوشمی روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حجۃ الوداع کے موقع پر سنا کہ آپ نے خطبہ میں حمد وثنا اور تذکیر ونصیحت کے بعد فرمایا کہ ''عورتوں کے ساتھ اچھا معاملہ رکھو اس لیے کہ وہ تمہاری زندگی میں تمہاری معاون اور رفیقۂ حیات ہیں، ان کا حق ہے، تم ان کو اچھا کھلاؤ اور اچھا پہناؤ''۔(۲)

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اہل ایمان میں سب سے زیادہ کامل الایمان وہ ہے جو سب سے زیادہ خوش خلق ہو اور تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں، جو اپنی بیویوں کے لیے سب سے بہتر ہوں''۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''دنیا ایک گزارہ کی چیز ہے اور اس کی سب سے بڑی دولت نیک بی بی ہے''۔(۳)

اس ازدواجی تعلق کی اہمیت کا اندازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس خطبۂ نکاح سے ہوتا ہے جس میں سورۂ نساء کی پہلی آیت پڑھی گئی، اس میں نسل انسانی کے آغاز کا تذکرہ ہے، جو اس مبارک موقع پر نہایت مناسب اور فالِ نیک ہے کہ حضرت آدمؑ کی ایک اکیلی ہستی تھی اور ایک رفیقۂ حیات جن سے اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی کی تخلیق کی اور اس نے روئے زمین کو بھر دیا، اللہ تعالیٰ نے ان دو ہستیوں میں ایسی محبت والفت اور ان کی رفاقت میں ایسی برکت عطا فرمائی کہ آج دنیا اس کی گواہی دے رہی ہے، تو خدا کے لیے کیا مشکل ہے کہ ان دو ہستیوں سے جو آج مل رہی ہیں، ایک کنبہ کو آباد اور ایک خاندان کو شاد و بامراد کر دے؟ پھر فرماتا ہے کہ اپنے اس پروردگار سے شرم کرو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ساری زندگی سوالات کا مظہر اور نمونہ ہے، یہی متمدن زندگی کا خاصہ ہے، یہ عقد اور نکاح کیا ہے؟ یہ بھی ایک مہذب

---

(۱) مسند امام احمد و صحیح مسلم۔ (۲) ترمذی شریف (حدیث حسن صحیح)
(۳) صحیح مسلم، حقوق زوجین کے بارہ میں مذاہب اور اخلاقیات کے تقابلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو، سیرۃ النبی جلد ششم تالیف علامہ سید سلیمان ندویؒ کا عنوان ''حقوق زوجین'' ص ۲۴۸ تا ۲۶۴

اور مبارک سوال ہے، ایک شریف خاندان نے ایک دوسرے شریف خاندان سے سوال کیا کہ ہمارے نورِ عین اور لختِ جگر کو رفیقۂ حیات کی ضرورت ہے، اس کی زندگی نامکمل ہے، اس کی تکمیل کیجئے، دوسرے شریف خاندان نے اس سوال کو خوشی سے قبول کیا، پھر وہ دونوں اللہ کا نام بیچ میں لاکر ایک دوسرے سے مل گئے اور دو ہستیاں جو کل تک ایک دوسرے سے سب سے زیادہ بے گانہ، سب سے زیادہ اجنبی اور سب سے زیادہ دور تھیں، وہ ایسی قریب اور یگانہ بن گئیں کہ ان سے بڑھ کر یگانگت اور قرب کا تصور بھی نہیں ہوسکتا، ایک کی قسمت دوسرے سے وابستہ اور ایک کا لطف وانبساط دوسرے پر منحصر ہوگیا، یہ سب اللہ کے نام کا کرشمہ ہے، جس نے حرام کو حلال، ناجائز کو جائز، غفلت ومعصیت کو طاعت وعبادت بنادیا اور زندگیوں میں انقلاب عظیم برپا کردیا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب اس نام کی لاج رکھنا، بڑی خودغرضی کی بات ہوگی کہ تم یہ نام درمیان میں لاکر اپنی غرض پوری کرلو اور کام نکال لو، پھر اس پُرعظمت نام کو صاف بھول جاؤ، اور زندگی میں اس کے مطالبات پورے نہ کرو، پھر فرمایا کہ ہاں رشتوں کا بھی خیال رکھنا، اس رشتہ سے قدیم رشتوں کا دور اور ان کے حقوق ختم نہیں ہوجاتے اور اگر کسی کے دل میں یہ خیال آئے کہ ایسی باتوں کی کون نگرانی کرے گا، اور کون ہمیشہ ساتھ رہے گا، تو فرمایا:۔

"اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً". (۱)

اللہ تعالیٰ دائمی نگراں اور محاسب ہے۔

اس کے برخلاف مختلف قدیم مذاہب اور قدیم وجدید تہذیبوں میں عورت کو کیا درجہ اور کیا حقوق دیئے گئے ہیں، اس سے واقفیت کے لیے وسیع النظری اور ہمت ومحنت کے ساتھ مذاہب اور تہذیبوں کے بارہ میں تقابلی مطالعہ کی ضرورت ہے۔ (۲)

---

(۱) ملاحظہ ہو سورۂ نساء کی پہلی آیت، پورے خطبہ کی تشریح اور اس کے نکات وحقائق کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب ''ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں'' ص ۴۰ تا ۴۴ شائع کردہ ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ''

(۲) نمونہ کے طور پر ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کی کتاب ''المرأة بين الفقه والقانون'' طبع پنجم، المكتب الاسلامی بیروت ودمشق، ص ۱۳-۲۲، اور اس کا عنوان ''المرأة في الحضارة الغربية'' ص ۲۶۸-۲۷۸ ملاحظہ ہو۔

اب یہاں پہنچ کر ہم اسلام کے عائلی قانون اور حقوق زوجین کے بارہ میں چند غیر مسلم فضلاء اور ماہرین قانون کے اعترافات اور تصریحات پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ بعض مسلم مکاتب خیال اور ناعاقبت اندیش مسلمان اہل قلم کی تحریروں اور اعلانات سے ہندی و انگریزی پریس میں اسلام کا عائلی قانون اور اس کا ازدواجی نظام، اور اسلام میں رفیقۂ حیات ہی نہیں عورت کا درجہ طنز و اعتراض اور تحقیر و تضحیک کا موضوع بن گیا۔

ہم یہاں تین چار شہادتوں پر اکتفا کرتے ہیں، ان میں سے ایک شہادت ایک مغربی فاضلہ کی ہے، جو ہندوستان میں ایک تربیتی و اصلاحی تحریک کی قائد رہی ہیں، اور انھوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا تھا، ہماری مراد مسز اینی بسنت (Mrs. Annie Besant) سے ہے، وہ کہتی ہیں:۔

> ''ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ عورتوں کے متعلق اسلام کے قوانین ابھی حالیہ زمانہ تک انگلینڈ میں اپنائے جا رہے تھے، یہ سب سے منصفانہ قانون تھا، جو دنیا میں پایا جاتا تھا، جائداد، وراثت کے حقوق اور طلاق کے معاملات میں یہ مغرب سے کہیں آگے تھا، اور عورتوں کے حقوق کا محافظ تھا، یک زوجگی اور تعدد ازواج کے الفاظ نے لوگوں کو مسحور کر دیا ہے، اور وہ مغرب میں عورت کی اس ذلت پر نظر نہیں ڈالنا چاہتے جسے اس کے اوّلین محافظ سڑکوں پر صرف اس لیے پھینک دیتے ہیں کہ ان سے ان کا دل بھر جاتا ہے اور پھر ان کی کوئی مدد نہیں کرتا''۔(۱)

مسٹر (N.J. Coulson) لکھتے ہیں:۔

> ''بلاشبہ عورتوں کی حیثیت کے بارہ میں خاص طور پر شادی شدہ عورتوں کے معاملہ میں قرآنی قوانین افضلیت کا مقام رکھتے ہیں، نکاح اور طلاق کے قوانین کثیر تعداد میں ہیں جن کا عمومی مقصد عورتوں کی حیثیت میں بہتری لانا ہے اور وہ عربوں کے قوانین میں انقلاب انگیز تبدیلی کے

---

(۱) Annie Besant, The life and Teaching of Mohammad, Madras-1932-P3

مظہر ہیں...........اسے قانونی شخصیت عطا کی گئی جو اس سے پہلے حاصل نہیں تھی، طلاق کے قوانین میں قرآن نے سب سے بڑی تبدیلی جو کی ہے وہ عدت کو اس میں شامل کرنا ہے"۔(۱)

مذاہب و اخلاق کے انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:۔

"پیغمبر اسلام نے یقیناً عورت کا درجہ اس سے زیادہ بلند کیا جو اسے قدیم عرب میں حاصل تھا، خصوصی طور پر عورت متوفی شوہر کے ترکہ کا جانور نہیں رہی بلکہ خود ترکہ پانے کی حقدار ہوگئی اور ایک آزاد فرد کی طرح اسے دوبارہ شادی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا، طلاق کی حالت میں شوہر پر یہ واجب ہوگیا کہ اسے وہ سب چیزیں دے دے جو اسے شادی کے وقت ملی تھیں۔

اس کے علاوہ اعلیٰ طبقہ کی خواتین علوم و شاعری سے دلچسپی لینے لگیں اور کچھ نے استاد کی حیثیت سے بھی کام کیا، طبقۂ عوام کی عورتیں اپنے گھر کی مالکہ کی حیثیت سے اپنے خاوندوں کی خوشی اور غم میں شریک ہونے لگیں، ماں کی عزت کی جانے لگی"۔(۲)

تقابلی قوانین کی بین الاقوامی کانفرنس (International Conference on Comparative Law) منعقدہ پیرس کی ایشیائی قوانین کے مطالعہ کی شاخ (Branch of Oriental Studies) نے جس میں مغرب و مشرق کے فضلاء قانون شریک تھے، رزولیشن مورخہ ۷ر جولائی ۱۹۵۱ء میں کہا ہے: "اسلامی قوانین پر ہفتہ بھر چلنے والے مباحثوں سے مندوبین کے سامنے یہ بات ابھر کر آئی کہ اسلامی قوانین کے اصولوں کی افادیت میں کوئی شبہ نہیں ہے، قانون کی اس عظیم شاخ میں وہ تمام اصول و طریقۂ کار موجود ہیں، جو اسے جدید زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کا اہل بناتے ہیں"۔(۳)

حضرات!

---

(۱) N.J. Coulson Islamic Surveys : A History of Islamic Law, Edinburg 1971, P.14

(۲) Encyclopedia of Religion and Ethics, Newyork, 1912, Vol. V, P.271

(۳) Islamic Studies Quarterly, Vol. XXIII, No. 4

یہ واقعہ ہے کہ ملک کے عام باشندوں اور خاص طور پر اخبار بینوں اور ملک میں پیش آنے والی تحریکوں اور سرگرمیوں پر نظر رکھنے والوں کو معلوم ہے کہ جب سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف جس میں مطلّقہ کو حین حیات نفقہ دلانے کا فیصلہ کیا گیا تھا، مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا اور اس کے ایما اور ہدایت پر وہ ملک گیر تحریک چلی جس کی اپنی عمومیت، باہوش جوش اور سنجیدگی اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں، تنظیموں اور مکاتبِ خیال کے اتحاد و تعاون میں تحریک خلافت کے علاوہ اور اس کے بعد کوئی نظیر نہیں ملتی، تو ہندوستان کے غیر مسلم صحافیوں، دانشوروں اور عوام کی طرف سے ایک ایسے ردّ عمل، جوش و نفرت اور خوف و ہراس کا مظاہرہ ہوا کہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید اس ملک پر کوئی غیر ملکی طاقت حملہ کرنے والی ہے یا بجلی گرنے والی ہے یا زلزلہ آنے والا ہے، حالانکہ یہ اس حقیقت پسندی اور اس احساس تناسب (Sense of Proportion) کے خلاف ہے جس پر زندگی کا نظام چل رہا ہے، مسئلہ جس نسبت سے توجہ، فکر و پریشانی کا مستحق ہے اسی نسبت سے اس کی طرف توجہ اور اس میں توانائی صرف کرنے کی ضرورت ہے، رائی کا پربت بنانا نہ عقل سلیم کا تقاضا ہے نہ عقل عملی (Practical Wisdom) کا، سب کو معلوم ہے کہ اس ملک میں مطلوبہ جہیز نہ لانے پر دُلہنیں اور معصوم لڑکیاں جلادی جاتی ہیں، ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں، نیشنل پریس کے ایک صحیفہ "قومی آواز" دہلی ۱۰ر جون ۱۹۸۴ء کے بیان کے مطابق "صرف دہلی میں ہر بارہ گھنٹہ پر ایک نئی بیاہی دُلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے" پھر اس سرزمین پر جہاں ہم آپ اس وقت جمع ہیں، مختلف اطراف میں سَتی کی رسم اب بھی جاری ہے، اور اسکے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، ایسی صورت میں کیا احساس تناسب، عقل سلیم اور انسانی ہمدردی بلکہ اپنے فرقہ سے محبت کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ ان مظالم کی طرف توجہ اس سے کہیں زیادہ کی جائے جو مسلمانوں کے اپنے اسلامی عائلی قانون کے تحفظ کے مطالبہ اور یونی فارم سول کوڈ کی مخالفت میں کی جارہی ہے جس سے ملک میں حقیقی اتحاد پیدا ہونے کی امید رکھنا محض خوش فہمی اور دنیا کے واقعات سے اور دو گذشتہ جنگ عظیم

سے سبق لینے کے مخالف ہے، جوایک ہی عائلی قانون اور سول کوڈ کی ماننے والی دو پروٹسٹنٹ عیسائی قوموں اور ملکوں کے درمیان ہوئی۔

پھر یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے تھا کہ اسلام اور مسلمانوں میں عورت کی شادی ہوجانے کے بعدوہ اپنے خاندان، والدین اور بھائیوں سے کٹ نہیں جاتی، اور مسلمان مُطلقہ خاتون طلاق کے بعد یکسر لاوارث اور بھیک مانگنے یا زندگی کا خاتمہ کرنے پر مجبور نہیں ہوتی، نکاح اور طلاق دونوں حالتوں میں وہ خاندان کے ایک فرد، ماں باپ (اگر وہ زندہ ہیں) کی بیٹی اور بھائی بہنوں کی بہن ہوتی ہے، وہ ترکہ (Heritage) اور جائداد میں اس پورے حصہ کی مستحق ہوتی ہے، جوشریعت اسلامی نے مقرر کردیا ہے، اور جس کا قرآن مجید میں ذکر اور اس کے دینے کی تاکید ہے۔

اس کے برخلاف ہندو معاشرہ اور سماج میں عورت شادی کے بعد اپنے خاندان، ماں، باپ، بھائی بہنوں سے کٹ جاتی ہے، اس کی کفالت کی ذمہ داری سرتاسر شوہر پر عائد ہوتی ہے، اور شوہر کے انتقال پر عورت بالکل لاوارث اور تنہا ہوجاتی ہے اسی صورت حال اور رواج نے قدیم زمانہ میں (جس کی تاریخی تحدید مشکل ہے) خواتین کے طبقہ کو جو بیوگی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ ستی کی رسم کی طرف مائل کیا جو اس کس مپرسی اور لاوارثیت سے نجات پانے کا واحد راستہ نظر آتا تھا۔

حضرات!

سپریم کورٹ کے فیصلہ کی منسوخی (جس میں مطلقہ کو حین حیات نفقہ دینے کو لازم قرار دیا گیا تھا) اور پارلیمنٹ میں اس کے خلاف ممتاز تاریخی غیر معمولی اکثریت کے ساتھ پرسنل لا بورڈ کے مطالبہ اور مسلمانوں کی رائے عامہ کے مطابق بل پاس ہوجانے کا جو تاریخ ساز اور یادگار واقعہ پیش آیا اور جس میں مسلم پرسنل لا بورڈ کو کھلی کامیابی ہوئی، اس کے بعد بھی مسلم پرسنل لا بورڈ کا (اور حقیقتاً شریعت اسلامی کی حفاظت وحمایت کرنے والوں اور مسلمانوں کے عائلی قانون (پرسنل لا) کے باقی رہنے کی جدوجہد کرنے والوں کا) کام ختم نہیں ہوا بقول شاعر۔

مکتب عشق کا دیکھا یہ نرالا دستور
اس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

اس کے بعد ایک اہم مرحلہ تو یہ ہے جو بورڈ کی توجہ کا موضوع اور حقائق و واقعات کا فطری تقاضا کہ بل کے پارلیمنٹ سے پاس ہوجانے کے بعد بھی ہندوستان کی بعض ریاستوں اور بعض مقامات کی عدالتیں سپریم کورٹ کے سابقہ فیصلہ کے مطابق مطلقہ کو حین حیات نفقہ دینے کی حق میں فیصلہ کررہی ہیں، جو صریح قانونی تضاد بلکہ حقیقتاً ایک منظور شدہ قانون سے بغاوت کے مرادف ہے، جو مرکزی حکومت کا پاس کیا ہوا ہے، اور واجب العمل ہے، اس کے لیے بورڈ کی مجلس منتظمہ اور اس کے قانون داں ارکان اور وکلاء کوشش کررہے ہیں اور اس سلسلہ میں مقدمات بھی دائر ہوئے ہیں یہ مرکزی حکومت کا فرض تھا اور ہے کہ وہ اپنے وزیر قانون کے ذریعہ یا اپنے اختیارات سے اس سلسلہ کو بند کرائے، اس سلسلہ میں بورڈ کے ایک وفد نے سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ جی سے ملاقات بھی کی تھی اور ان کی توجہ مبذول کرائی تھی، اور انھوں نے اس کا وعدہ بھی کیا تھا، لیکن نہ ان کے عہد حکومت میں اس پر کوئی توجہ دی جاسکی اور نہ بعد کی حکومتوں کو اپنی اس ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے اور اس میں مرکزی حکومت کی اہانت محسوس ہوتی ہے، ضرورت ہے کہ پوری توجہ اور تنظیم و امن کے ساتھ احتجاج اور قانونی چارہ جوئی کا سلسلہ جاری رہے ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں ان محنتوں پر پانی نہ پھر جائے جو اس سلسلہ میں کی گئیں۔

۲۔ بورڈ کے اہم ترین اور بنیادی مقاصد میں اصلاح معاشرہ کا کام داخل ہے اس سلسلہ میں کوششیں ہوتی رہی ہیں، جلسے بھی اور دورے بھی ہوئے ہیں، جن میں سب سے بڑا عوامی جلسہ اور اجتماعی یکم مارچ ۱۹۹۲ء کو پٹنہ کے گاندھی میدان میں ہوا، جس کی اپنی وسعت اور مقبولیت میں دور دور تک اور دیر دیر تک نظیر نہیں ملتی، لیکن ضرورت ہے کہ اس کے لیے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ہندگیر دورے اور عظیم و وسیع جلسے ہوں، دینی جلسوں اور مساجد کے مواعظ و خطبات کا بھی یہ موضوع بن جائے اور عام زندگی پر اس کا اثر پڑے۔

۳۔ عرصہ سے اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ اسلامی عائلی قانون کے موضوع پر ایک مستند اور مفصل کتاب تیار کی جائے جو آزاد اور شرعی دارالقضاء سے لے کر سرکاری عدالتوں تک میں ایک قابل اعتماد حوالہ کی کتاب اور فقہی مرجع ہو، انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں محمڈن لا (Mohammadan Law) پر مسلمان ماہرین قانون سے کتابیں لکھوائیں، جن میں جسٹس سید امیر علی اور جسٹس عبدالرحیم کی کتابیں خاص طور پر مشہور و مقبول ہوئیں اور وکلاء اور ججوں نے ان پر اعتبار کیا۔

لیکن ضرورت تھی کہ ازسرِ نو اور زیادہ محنت، وسیع النظری اور دقیق النظری کے ساتھ ہندوستان کے مستند علماء و ماہرین فقہ وحدیث اس کام کو انجام دیں اور ایک ایسی نئی کتاب کی ترتیب عمل میں آئے جو مرجع اور سند کا کام دے۔

اس ضرورت کا احساس سب سے پہلے مسلم پرسنل لا بورڈ کے بانی امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کو ہوا، جن کو اللہ تعالیٰ نے دوبینی، بیدار مغزی اور حقیقت شناسی اور خطرات کی آگاہی کی دولت سے خاص طور پر بہرہ مند فرمایا تھا، اور اسی بصیرت اور ذہانت وتوفیق الٰہی نے ان سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کا کام لیا اور انھوں نے اپنی نگرانی و سرپرستی میں مونگیر میں یہ کام شروع کرادیا لیکن اس کام کی تکمیل کی نوبت نہیں آئی تھی کہ انھیں سفر آخرت پیش آ گیا۔

لیکن مولانا مرحوم کی وفات کے بعد بھی بورڈ اور امارتِ شرعیہ نے اس کام کو جاری رکھا اور ہندوستان کے مستند و ممتاز علماء، ماہرین فقہ اور مفتیان عظام نے اپنے مقامات سے سفر کر کے مونگیر اور پٹنہ میں ربیع الاول ۱۴۱۸ھ میں توفیق واعانت الٰہی سے یہ کام مکمل کرلیا، جس کو فی الحال "اسلام کی عائلی قوانین کی دفعہ وار تدوین" کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ (۱)

---

(۱) اس تدوینی اور اہم علمی کام میں جن لوگوں نے زیادہ سے زیادہ وقت دیا اور اس کے مستقل شرکاء تھے ان میں مولانا مفتی نعمۃ اللہ، (مفتی امارت شرعیہ) مولانا محمد برہان الدین صاحب سنبھلی (دارالعلوم ندوۃ العلماء) مولانا مفتی احمد علی سعید (دارالعلوم وقف) مولانا ظفیر الدین (دارالعلوم دیوبند) اور مولانا نصر اللہ مفتی امارت شرعیہ کا خاص حصہ ہے، جزوی شرکاء میں مولانا قاضی مجاہد الاسلام (قاضی امارت شرعیہ) مولانا ولی رحمانی (سجادہ نشین خانقاہ رحمانیہ و نگراں مجلس و میزبان) ہیں۔

ضرورت ہے کہ اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ شائع ہوتا کہ وکلاء اور جج صاحبان بھی اس سے فائدہ اٹھاسکیں، اور قدیم محمڈن لا کی کتابوں کے قائم مقام ہو، اور اس کی ایک سند اور مرجع کی حیثیت ہو۔

حضرات سامعین کرام! اب میں دین کے ایک نمائندہ اور داعی کی حیثیت سے اور ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے آپ سے ایمانی وقرآنی زبان میں کچھ خطاب کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے بغیر یہ شرف جو آپ نے اس عاجز کو بخشا ہے، اور یہ قیمتی وقت جو آپ نے اس موقر مجلس میں شرکت کے لیے دیا ہے، اس کا حق نہیں ادا ہوگا اور اندیشہ ہے کہ اللہ کے یہاں محاسبہ ہو، یہاں پر میں اس عرض داشت کا اعادہ کروں گا جو دہلی کے اجلاس منعقدہ ۲۳، ۲۴ رنومبر ۱۹۹۱ء میں کی گئی تھی۔

آپ دیکھئے کہ آپ اسلامی وقرآنی قانون معاشرت کا خود کتنا احترام کرتے ہیں، اس پر خاندانی روایات کو اور رسم ورواج کو کتنی ترجیح دیتے ہیں؟ اس پر اس کا اضافہ کیجئے جو آپ نے اپنے ہم وطنوں سے سیکھا ہے، جہیز کا بڑھا چڑھا مطالبہ ہم میں کہاں سے آیا؟ اس کو کسی نام سے یاد کیا جاتا ہو، یہ چیز کہاں سے آئی؟ مکہ ومدینہ، حرمین شریفین سے آئی ہے؟ قرآن مجید کے راستہ سے آئی ہے؟ یہ لعنت کہاں سے آئی؟ جب آپ اس کو قبول کرتے ہیں تو بطور سزا کے آپ کی غیرتِ ملی کو، آپ کے وجودِ ملی کو بار بار نشانہ بنایا جاتا ہے۔

لیکن جب ہم اہل حکومت اور برادران وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ سے شکایت کرنے کا حق کیوں نہ ہو؟ ان سے تو شکایت کریں گے اور ان کا دامن پکڑیں گے لیکن آپ کا گریبان پکڑلیں گے اور وہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہوگا، وہ دینی احتساب کا ہاتھ ہوگا، وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا جو آپ کا گریبان پکڑے گا اور کہے گا کہ پہلے تم اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھو کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو، تمہاری نگاہوں میں اس قانون کی کتنی حرمت ہے؟ تم جہاں اس قانون کو چلا سکتے ہو وہاں چلا رہے ہو کہ نہیں؟ تم تو اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے قانون کو چلائے اس کا احترام کرے۔

یہاں سے یہ عہد کر کے جائیے کہ اب قانون شریعت پر آپ چلیں گے، یہ جہیز کی کیا مصیبت ہے؟ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کئے جاتے ہیں، ان کے پورا نہ ہونے پر یہ معصوم لڑکیاں جلادی جاتی ہیں ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں، کیا اس کائنات کے خالق اور نوع انسانی کے مُربّی کو (جس کی مخلوق مرد وعورت دونوں ہیں) یہ چیز گوارا ہوسکتی ہے؟ کیا اس ظلم کے ساتھ کوئی ملک، کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے؟ خدا کی رحمت و نصرت کا مستحق ہوسکتا ہے؟ آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی ہمت نہیں ہونی چاہئے تھی، میں نے دہلی ہی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

"وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ، وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ". (سورة الانفال:۳۳)

اور خدا ایسا نہ تھا جب تک تم ان میں تھے انھیں عذاب دیتا اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور انھیں عذاب دے۔

آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہندوستانی سماج میں، ہندوستان کے معاشرہ اور سوسائٹی میں یہ ظلم ہو، اس کو عقل قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، آپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں ہونا چاہئے تھا چہ جائیکہ آپ کے ہاتھوں ہو، عہد کیجئے کہ آپ اسلامی طریقہ پر، شریفانہ انسانی طریقہ پر شادی کا پیام دیں گے، آپ لڑکی مانگیں گے، اپنے لیے رفیقہ حیات کی تلاش کریں گے، بیٹے کے لیے پیام دیں گے، جہیز کے لیے آپ کے بڑھے چڑھے مطالبات نہیں ہوں گے کہ ہمیں یہ ملنا چاہئے، وہ ملنا چاہئے، لڑکوں کو اور ان کے وارثوں اور بزرگوں کو اس کا عہد کرنا چاہئے کہ ہم اپنے یہاں تو کیا ہم اس ملک سے اس رسم کو ختم کردیں گے۔

ایسے ہی ترکہ شرعی طریقہ پر تقسیم ہونا چاہئے، نکاح شرعی طریقہ پر ہو اور طلاق کا مسنون طریقہ معلوم کرنا چاہئے، مسنون اور افضل طریقہ کیا ہے، پھر اسکے بعد فقہی طلاق جس سے طلاق واقع ہوجاتی ہے اس کو سمجھنا چاہئے، یہ بھی جاننا چاہئے کہ طلاق رجعی کیا ہوتا

ہے؟ طلاق بائن، مغلّظہ کیا ہوتا ہے؟ پھر آپ یہ بھی سمجھیں کہ طلاق اَبغض المباحات ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جائز ہے لیکن آخری درجہ کی چیز ہے، بڑی مجبوری کی چیز ہے، جو اپنے کو حرام چیزوں سے اور زندگی کو تلخ بننے سے بچانے کے لیے بہت مجبوری سے دل پر پتھر رکھ کر اختیار کی جاتی ہے، یہ نہیں کہ طلاق ایک فیشن ہوگیا ہے، جو لوگ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے ہیں اس میں تھوڑی سی ہماری کوتاہی کو بھی دخل ہے، جتنا طعنہ دیتے ہیں اتنے کے مستحق تو ہم ہرگز نہیں ہیں۔(۱)

حضرات! اب آپ اس اجلاس سے جو جے پور میں ''جامعہ ہدایت'' کے سایہ میں ہو رہا ہے، اپنے اپنے مقامات پر واپس جائیں گے، ضرورت ہے کہ آپ جامع پیغام ہدایت لے کر جائیں اور یہ اجلاس نہ صرف آپ کے عائلی اور خاندانی دائرہ میں کتاب وسنت اور ہدایت ربانی کے مطابق زندگی گزارنے، اہل حقوق کو ان کے حقوق ادا کرنے اور ایک صالح وعادل اور متبع سنت معاشرہ کا نمونہ پیش کرنے کا باعث ہو بلکہ آپ کے ذریعہ آپ کے ہم وطن اور ہم شہر مسلمانوں ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کے سامنے بھی اسلامی عائلی زندگی اور صالح معاشرہ کا ایک ایسا نمونہ سامنے آئے جس سے ان کو نہ صرف اسلام کی تعلیمات کی قدر اور اعتراف ہو بلکہ اس کی طرف کشش اور انجذاب پیدا ہو۔

وماذلك على الله بعزيز.

---

(۱) مسلمانوں میں طلاق کی شرح وہ نہیں ہے، جو بیان کی جاتی ہے، اس میں مبالغہ اور رنگ آمیزی سے کام لیا جاتا ہے پھر بھی تھوڑی سی بے اعتدالی ضرور ہے۔

عورت کا اسلام میں مرتبہ اور اس کے حقوق
اور قوانین مروّجہ ایک تقابلی مطالعہ

خطبہ صدارت

اجلاس دوازدہم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
منعقدہ ۷، ۸/اکتوبر ۱۹۹۵ء، بمقام احمد آباد، گجرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العٰلمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین محمدو آلہ وصحبہ اجمعین ومن تبعھم باحسان ودعا بدعوتھم الیٰ یوم الدین.

حضرات علمائے کرام، برادران اسلام وحاضرین جلسہ!

اہل عرب جب کسی عمل یا کارروائی کے متعلق یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ وہ برمحل اور برموقع ہوئی تو کہتے ہیں "جاء فی مکانہ وفی اوانہ" یہ بات اپنے صحیح محل ومقام اور مناسب موقع پر اور وقت پر پیش آئی (یا پیش کی گئی)

اس حقیقت پسندانہ جملہ کی روشنی میں پہلے اس حقیقت اور واقعہ کا اعتراف واعلان کیا جاتا ہے کہ "مسلم پرسنل لا بورڈ" کا یہ بارہواں اجلاس اپنے صحیح محل ومقام پر ہورہا ہے، اور پھر عرض کیا جائے گا کہ وقت اور ضرورت کے تقاضہ کی بناء پر منعقد کیا جارہا ہے اور وہ ایک فریضہ کی ادائیگی اور حقیقت پسندی اور فرض شناسی کا ثبوت ہے۔

صوبہ گجرات کی شاندار علمی وتہذیبی تاریخ اور اس کا تقاضہ

جہاں تک اجلاس کے محل ومقام کی مناسبت اور اس اہم اجلاس کے یہاں منعقد کرنے کے جواز بلکہ معقولیت اور صحیح انتخاب کا سوال ہے، صوبۂ گجرات (جو اس صوبہ کا قدیم تاریخی اور علمی دنیا میں معروف نام ہے) کے بارے میں ہندوستان کے اسلامی عہد کے سب سے بڑے مؤرخ وسوانح نگار پدر بزرگوار مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء(۱) کی کتاب کے چند اقتباسات پیش کرنے پر قناعت کی جائے

(۱) متوفی ۱۳۴۲ھ-۱۹۲۳ء، ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "نزھۃ الخواطر یا الاعلام بمن فی تاریخ الھند من الاعلام(۱-۸) الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند، الھند فی العھد الاسلامی. (عربی) یادایام یا تاریخ گجرات اور گل رعنا (اردو)

گی، جو گجرات کے بارے میں پائے جاتے ہیں:

"علوم وفنون میں اگر گجرات شیراز تھا، تو حدیث کی خدمات کے لحاظ سے یمن میمون سے مماثلت رکھتا تھا، علم حدیث کی سرگرمی کے ساتھ ساتھ یہاں فقہ میں بھی شاندار کارنامے انجام پائے تھے، ہندوستان کے کسی دوسرے علاقہ کی علمی اور تمدنی سرگرمیوں کی تاریخ اتنی مسلسل اور طویل نہیں ہے جتنی گجرات کی"۔

اس اجلاس وموضوع کی مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ گجرات کا فقہ حنفی اور اصول فقہ میں بھی امتیازی حصہ ہے، یہاں مفتی رکن الدین ناگوری نے جو نہروالہ کے مفتی تھے، فقہ حنفی کی دوسو چار کتابوں کو پیش نظر رکھ کر فتاویٰ حمادیہ تصنیف کی، جس کے حوالے فتاویٰ عالمگیری میں جابجا ملتے ہیں۔

اسی طرح مفتی قطب الدین (م ۹۹۹ھ) کا ذکر کئے بغیر بھی رہا نہیں جاتا جن کو حرم شریف میں درس دینے کا شرف حاصل ہوا، علامہ قاضی شوکانی صاحب نیل الاوطار نے اپنی کتاب "البدر الطالع" میں بڑے بلند الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حرمین شریفین اور دیار عرب میں، جن کے فضل وکمال کا سب سے زیادہ اعتراف کیا گیا، اور جن سے استفادہ کو باعث فخر وشرف سمجھا گیا، وہ زیادہ تر علمائے گجرات تھے، وکفیٰ بہ فخراً وشرفاً۔

اس سلسلہ میں وزیر آصف خان کا نام لینا کافی ہوگا، جن کو یہ شرف وخصوصیت حاصل ہے کہ علامہ ابن حجر مکی نے ان کے حالات پر مستقل رسالہ لکھا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:۔

"جس زمانہ میں آصف خاں مکہ معظمہ میں آکر رہے تھے، عجب طرح کی رونق مکہ معظمہ میں پیدا ہوگئی تھی، علماء وفقہاء ان کی صحبت کو غنیمت سمجھتے تھے، گھر گھر علم کا چرچا ہوگیا تھا، مکہ والوں نے تحصیل علم میں پوری کوشش کی تھی، انہوں نے اہل علم پر اپنے احسان وکرم کے دائرہ کو اس قدر وسیع کر دیا تھا، جس کی نظیر ان کے معاصرین میں بلکہ ایک مدت سے مفقود تھی، علامہ عزالدین عبدالعزیز مکی نے آصف خاں کی مدح میں چھیاسی

شعر کا قصیدہ لکھا''۔

علوم دینیہ بالخصوص فقہ وقضاء وافتاء کی صلاحیت میں علمائے گجرات کے امتیاز واختصاص کا نتیجہ تھا کہ سلطنت دہلی نے بھی، ان کے اس امتیاز واختصاص سے فائدہ اٹھایا، اوران کو''قاضی القضاۃ'' کے عہدہ پر فائز کیا، قاضی شیخ الاسلام گجراتی دارالملک دہلی کے قاضی تھے، ۱۰۸۶ھ میں عالمگیر نے ان کو مجبور کر کے''اقضی القضاۃ'' کا عہدہ عنایت کیا، اس عہدۂ جلیلہ کے فرائض انہوں نے نہایت آزادی اورراست بازی کے ساتھ انجام دیئے اورحق بات کے ظاہر کرنے میں کسی بادشاہ کے سامنے بھی نہیں چوکے، ان کے بعدان ہی کے داماد قاضی ابوسعید ۱۰۹۴ھ میں ان کی جگہ''اقضی القضاۃ'' کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے، عہد عالمگیری میں دہلی کے''اقضی القضاۃ'' کے عہدہ کے لیے گجرات ہی کے علماء کا منتخب ہونا، اس کے علمی وفنی امتیاز کا کھلا ثبوت ہے۔

شخصی، خاندانی وموروثی سلطنت کے دور میں والیان سلطنت اوران کے وزراء کا نہ صرف متبع شریعت وسنت ہونا، بلکہ صلاح وتقویٰ میں اورشرع ودین کی واقفیت میں ممتاز ہونا، پوری قلمرو، زیرحکومت علاقہ، اورخواص وعوام کے طبقہ پراثر انداز ہوتا ہے، اوراس سے پوری قلمرو میں دین کا احترام اورشریعت پر عمل کرنے کا جذبہ اوررجحان پیدا ہوجاتا ہے، اس سلسلہ میں بھی گجرات کو ایک محدود لیکن طویل مدت تک یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ یہاں بعض ایسے سلاطین صاحب اقتدار اورفرمانروائے ملک رہے ہیں، جن کی نظیر کم سے کم ہندوستان کے صوبوں کی تاریخ اورسلاطین وقت کی سوانح (سلطان محی الدین اورنگ زیب کو مستثنیٰ کر کے، جن کو بعض فضلائے عرب نے''سادس الخلفاء الراشدین'' کا لقب (۱) دیا ہے) میں مشکل سے ملتی ہے، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نمایاں مظفر شاہ حلیم گجراتی (م ۹۳۲ھ) کی ذات ہے، مولانا سید عبدالحی صاحبؒ، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''فضل وکمال کے ساتھ تقویٰ وعزیمت کی دولت بھی اس نے خداداد پائی تھی، تمام عمر نصوص احادیث پر عمل رہا، ہمیشہ باوضو رہنا، نماز

---

(۱) نامور عرب ادیب ومصنف علامہ علی الطنطاوی مراد ہیں۔

جماعت کے ساتھ پڑھنا، روزے عمر بھر نہیں چھوٹے''۔

ان سلاطین میں بعض ایسے سلاطین بھی گزرے ہیں، جن کی خدمت دین، اشاعت علم اوراس کی سرپرستی کا دائرہ گجرات ہی کے حدود سے نہیں بلکہ ہندوستان کے حدود سے بھی نکل کر مرکز ومصدر علم دین ''حجاز مقدس'' تک وسیع تھا۔ وکفی بہ فخراً وشرفاً.

مولانا سید عبدالحی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:۔

''محمود شاہ دوم (م ۹۶۱ھ) کی توجہ وسرپرستی سے مکہ معظّمہ میں ایک عظیم الشان مدرسہ باب عمرہ سے متصل قائم کیا گیا، جس میں علامہ شہاب الدین ابن حجر مکی اور عزالدین عبدالعزیز زمزمی وغیرہ علمائے مکہ، تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے، علاوہ اس کے کئی رباط اور مکتب مکہ معظّمہ میں تعمیر کیے گئے۔

محمود شاہ نے اس پر قناعت نہیں کی بلکہ اس نے خلیج کنبایہ (کھمبایت) میں ایک بندرگاہ کی آمدنی محض حرمین محترمین میں رہنے والوں کے واسطے وقف کردی تھی، یہاں سے ایک لاکھ اشرفیوں کی قیمت کا مال جدہ بھیجا جاتا تھا، اوراس کے بھیجنے میں جو کچھ صرف ہوتا تھا، وہ خزانہ شاہی سے دیا جاتا تھا، اس مال کے فروخت سے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی، وہ سب اہل حرمین محترمین پر تقسیم کردی جاتی تھی''۔(۱)

حضرات! ان قابل فخر تاریخی حقائق اور گجرات کے شاندار علمی ودینی دور کا تقاضا ہے کہ حفاظت وحمایت شریعت بلکہ غیرت دینی وحمیت اسلامی کا جو قدم ہندوستان بلکہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں اٹھایا جائے، اور مسلمانوں کو پوری شریعت پر عمل کرنے، جس میں وہ عائلی قانون (پرسنل لا) بھی داخل ہے، جس کی بنیاد کتاب وسنت کے نصوص، آیات قرآنی اوراحادیث صحیحہ پر ہے، اوراپنے معاشرتی معاملات، ازدواجی وعائلی زندگی کے مختلف مراحل اور تقاضوں کے سلسلہ میں شرعی وقانونی طور پر خودکفیل ہونے اوراپنے تشخص

---

(۱) یاد ایام ص: ۵٦ بحوالہ ظفر الوالہ مصنفہ محمد بن عمر الآصفی۔

کو برقرار رکھنے کی دعوت دی جائے تو اہل گجرات اس پر لبیک کہیں اور اس کے لیے اپنے صوبہ کی فضا کو موافق و معاون بنائیں، بلکہ اس کی کامیابی اور نفاذ کے لیے اگر ہندوستان کے کسی گوشہ سے بھی صدا لگائی گئی ہے، اور اس کے لیے جدوجہد شرع کی گئی ہے تو اس کے ساتھ پورا تعاون واشتراک کریں۔

اسلام کا عائلی قانون بلند و برتر اور فطرت انسانی کے مطابق ہے

حضرات! اب جب اسلام کے عائلی قانون کا تذکرہ آگیا ہے تو مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس عائلی قانون کی بلندی و برتری، اس کے انسانیت کے احترام، فطرت انسانی سے مطابقت، عورت کے اسلام میں مرتبہ اور اس کے حقوق کے اعتراف، اس کے ساتھ انصاف بلکہ رعایت وفیاضی کے بارے میں بھی کچھ عرض کیا جائے، اور قوانین مروجہ دنیا کے مختلف مذاہب وتہذیبوں، اور معاشرتی وازدواجی زندگی کے رائج الوقت نمونوں اور مناظر کو سامنے رکھ کر، تقابلی مطالعہ (Comparative Study) کی روشنی میں کچھ غیر مسلم مفکرین، ماہرین قانون، تمدن وتہذیب عالم کے مؤرخین اور فضلاء کے اقوال پیش کیے جائیں، جنہوں نے اسلام کے عائلی قانون کی برتری، انصاف پروری، احترام انسانی نہیں بلکہ احترام نسوانی کا برملا اعتراف کیا ہے، اس کی ضرورت اس لیے بھی محسوس کی جاتی ہے کہ عام طور پر غیر اسلامی ذرائع ابلاغ، پریس اور یک طرفہ ناقدین نے اس کے بارے میں عام طور پر یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کا عائلی قانون، طبقہ نسواں کے ساتھ انصاف پر مبنی نہیں ہے، وہ قدیم تہذیب ومعاشرت اور اس عہد کی یادگار ہے، جب عورت کو وہ درجہ نہیں دیا جاتا تھا جس کی وہ مستحق ہے، اور یہ قانون اب اس ترقی یافتہ دور میں باقی رہنے اور چلنے کے قابل نہیں ہے، جب حقائق سے پردہ اٹھ گیا ہے، قدیم رسم ورواج داستان پارینہ بن گئے ہیں۔ عورت زندگی میں برابر کی شریک ہے، اور اب ترقی یافتہ مغرب ہی اس سلسلہ میں قابل تقلید واستفادہ ہے۔

اس پروپیگنڈہ کا کچھ اثر مسلمان بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ پر بھی ہوا ہے،

اور وہ ایک طرح کے احساس کہتری (Inferiority Complex) میں مبتلا ہو گیا ہے اور اس میں اپنے عائلی قانون پر افتخار رہی نہیں، اعتماد واطمینان اور دفاع کا جذبہ بہت جگہ سرد پڑ گیا ہے، ہم اس موقع پر چند مغربی ماہرین قانون مؤرخین تمدن وتہذیب اور مغربی دانشوروں کے اقوال پیش کرتے ہیں، جنہوں نے صاف اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اسلام کا عائلی قانون، دوسرے قوانین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ منصفانہ، حقیقت پسندانہ، اور کہیں زیادہ طبقہ نسواں کے احترام اور اس کے ساتھ انصاف ومراعات پر مبنی ہے، یہ بیانات ہمارے مرعوب تعلیم یافتہ طبقہ کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دینے کے لیے کافی ہیں جس نے آزاد تقابلی مطالعہ کی زحمت گوارا نہیں کی، اور وہ یک طرفہ سطحی بیانات سے متاثر ہے۔

اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے ایک مغربی فاضلہ کا بیان پیش کرتے ہیں، اس لیے کہ اس سلسلہ میں خواتین زیادہ حساس (Sensitive) جذباتی، زود احساس اور رقیق الشعور (Sentimental) واقع ہوتی ہیں اس لیے کہ یہ ان کے طبقہ کا قضیّہ ہے، اور وہ اپنے طبقہ کی طرف سے دفاع اور اس کی حمایت اپنا فرض سمجھتی ہیں۔

مسز اینی بسنٹ (Mrs. Annie Besant) ہندوستان میں ایک تربیتی اصلاحی تحریک کی قائد اور جنوبی ہند کے ایک ثقافتی ادارہ (تھیا سوفیکل سوسائٹی) کی صدر رہی ہیں، انہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا تھا، وہ اپنی کتاب ''ہندوستان کے عظیم مذاہب'' میں لکھتی ہیں:۔

> ''قرآن مجید کی آیت ''وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولٰئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا''. (النساء: ١٢٤) (اور جو کوئی نیکیوں پر عمل کرے گا (خواہ) مرد ہو یا عورت اور وہ صاحب ایمان ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا) پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات عام اخلاقی ہدایات میں محدود نہیں، بلکہ عورتوں کی وراثت کے لیے پورا قانون قرآن

میں موجود ہے، اور وہ قانون اپنے عدل وانصاف اور آزادی کی وسعت اور کارفرمائی میں اس مسیحی وانگریزی قانون سے کہیں زیادہ فائق ہے، جس پر اب سے بیس سال پہلے تک برطانیہ میں عمل ہوتا رہا ہے، اسلام نے عورت کے لیے جو قانون بنایا ہے، وہ ایک مثالی قانون کا درجہ رکھتا ہے، اس نے عورتوں کے حقوق کی حفاظت، اور امکانی حد تک ان کی مدد کا ذمہ لیا ہے اور ان کے کسی ایسے حصہ پر (جو وہ اپنے اعزاء، بھائیوں اور شوہروں سے پائیں) دست درازی کا سدباب کر دیا ہے"۔(۱)

ایک دوسری جگہ لکھتی ہیں:۔

"یک زوجگی وتعدد ازدواج کے الفاظ نے لوگوں کو مسحور کر دیا ہے، اور وہ مغرب میں عورت کی اس ذلت پر نظر ڈالنا نہیں چاہتے، جس سے اس کے اوّلین محافظ سڑکوں پر صرف اس لیے پھینک دیتے ہیں کہ اس سے ان کا دل بھر جاتا ہے، اور پھر ان کی کوئی مدد نہیں کرتا"۔(۲)

عظیم ونامور فرنچ مصنف ودانشور گستاوَلیبان (Gustavli Bon) اپنی شہرۂ آفاق کتاب "تمدن عرب" میں لکھتا ہے:۔

"میراث کے وہ اصول جو قرآن میں صراحت کے ساتھ آئے ہیں، وہ عدل وانصاف کا ایک واضح مظہر ہیں، ان کے اور ان حقوق وقوانین کے درمیان مقابلہ کرنے سے جو فرانس وانگلستان میں عورت کے بارے میں ہیں، صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی نے شادی شدہ خواتین کو (جن کے بارے میں مغرب میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مسلمان ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے) میراث کے وہ حقوق دیئے ہیں جن کی نظیر ہمارے قوانین میں نہیں ملتی، اسلام کا اثر مشرق میں عورت کی پوزیشن پر بہت گہرا اور وسیع تھا، اس نے عورت کی معاشرتی پوزیشن

---

(۱) کتاب "ہندوستان کے عظیم مذاہب"۔

(۲) Annie Besant The Life of Muhammad, Madrasa. 1932. P3

کوگھٹانے کے بجائے بہت بلند کردیا ان تمام دعاوی ومزعومات کے خلاف، جوبغیر کسی دلیل ومطالعہ کے یورپ میں دہرائے جاتے ہیں، قرآن نے عورت کو وہ وراثتی حقوق عطا کئے ہیں، جو ہمارے مغربی قوانین سے کہیں بہتر ہیں، اسلام میں عورتوں کے مرتبہ واہمیت پر اس سے بھی روشنی پڑتی ہے کہ عربوں کے تمدن کے عروج کے زمانہ میں ان میں کثرت سے ایسی خواتین نظر آتی ہیں، جو بڑا بلند علمی وادبی مقام رکھتی تھیں (۱) عہد عباسی میں ان کی ایک بڑی تعداد مشرق میں اور عہد اموی میں اسپین (اندلس) میں پائی جاتی تھی''۔(۲)

والٹیر (Voltaire) اپنے مضمون میں، جو فلسفہ قرآن کے عنوان سے ہے، ڈکشنری آف فلاسفی (Dictionary of Philosophy) میں لکھتا ہے:۔

''ہم اس سے ناواقف نہیں ہیں کہ قرآن، عورت کا وہ امتیاز مانتا اور بیان کرتا ہے، جو اس کو فطرت کی طرف سے ملا ہے، لیکن قرآن اس بارے میں تورات سے مختلف نظر آتا ہے کہ وہ عورت کی فطری کمزوری کو ''خدائی سزا'' نہیں مانتا، جیسا کہ سفر التکوین الاصحاح الثالث نمبر ۱۶ میں ہے۔

یہ غلط بیانی اور تلبیس کی بات ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے عظیم شارع کی طرف عورتوں کے حق میں زیادتی وناانصافی منسوب کی جائے، حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ:

فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰىٓ اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ

---

(۱) ان باکمال وبافیض خواتین کی فہرست بہت طویل ہے، اور اس کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ مفید ہوگا، جن میں ان فاضلات ومعلمات، ادیبات وشاعرات اور صالحات وعابدات خواتین کے تراجم ہیں، یہاں پر صرف ایک نام لینا کافی ہوگا، جن کا نام کریمہ بنت احمد بن محمد المروزیۃ (م ۴۶۳ھ) تھا، اور جو صحیح بخاری (جو ''اصح کتاب بعد کتاب اللہ'' کہی جاتی ہے) کی راویہ تھیں اور ان سے کثیر التعداد طالبان علم حدیث اور محدثین نے سند لی ہے اور وہ اس بارے میں بہت سے مرد شیوخ حدیث سے زیادہ تلامذہ ومستفیدین کی تعداد رکھتی ہیں۔

(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''تمدن عرب'' کا باب چہارم ''مشرقی عورتوں کی حالت'' ترجمہ شمس العلماء سید علی بلگرامی مطبوعہ اتر پردیش اردو اکیڈمی، ص: ۳۶۵-۳۶۸

خَیْراً کَثِیْراً". (سورۃ النساء:۱۹)

اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں، تو عجب کیا کہ تم ایک شئی کو ناپسند کرو اور اللہ اس کے اندر کوئی بڑی بھلائی رکھ دے۔

نیز

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجاً لِّتَسْکُنُوْا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ".

(سورۃ الروم:۲۱)

اور اسی کی نشانیوں میں ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس کی بیویاں بنائیں تا کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے (یعنی میاں بیوی کے) درمیان محبت و ہمدردی پیدا کر دی بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے رہتے ہیں۔

ایک دوسرا مغربی مصنف اپنی کتاب (Defence of Islam) میں لکھتا ہے:

"اگر معاشرتی نقطۂ نظر سے یورپ میں عورت ایک بلند مرتبہ و مقام پر پہنچ گئی ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس کی پوزیشن مذہبی و قانونی حیثیت سے چند سال پہلے تک اور بعض مقامات پر اب تک) اپنے مرتبہ و مقام میں اس سے کم ہے، جو مسلمان خاتون کو عالم اسلامی میں حاصل ہے"۔(۱)

مسٹر (N.J. Coulson) لکھتے ہیں:۔

"بلاشبہ عورتوں کی حیثیت کے بارہ میں خاص طور پر شادی شدہ عورتوں کے معاملہ میں قرآنی قوانین افضلیت کا مقام رکھتے ہیں، نکاح اور طلاق کے قوانین کثیر تعداد میں ہیں، جن کا عمومی مقصد عورتوں کی حیثیت میں بہتری لانا ہے اور وہ عربوں کے قوانین میں انقلاب انگیز تبدیلی کے مظہر ہیں...... اسے قانونی شخصیت عطا کی گئی جو اس سے پہلے

(Spirit of Civilisation P.268)(۱)

حاصل نہیں تھی، طلاق کے قوانین میں قرآن نے سب سے بڑی تبدیلی جو کی ہے وہ عدت کو اس میں شامل کرنا ہے"۔(۱)

مذہب و معاشرت کا رشتہ اٹوٹ ہے

حضرات!

ان نقول و اقتباسات کے جو اسلام کے عائلی قانون کی نہ صرف معقولیت، انصاف پسندی بلکہ امتیاز و برتری کی شہادتوں پر مشتمل تھے، پیش کرنے کے بعد اہل دین واہل دانش کے اس تاریخی اجتماع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ حقیقت بھی پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ نفسیات اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت وتہذیب سے الگ نہیں کیا جا سکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی، اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر ومحفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے، اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اپنے عائلی وخاندانی روابط وتعلقات میں مسلمان نہیں، حقوق کی ادائیگی میں اور ترکہ کی تقسیم میں مسلمان نہیں۔

اس لیے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت، نظام تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اس کو دعوت ارتداد سمجھتے ہیں، اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے جیسے دعوت ارتداد کا کرنا چاہئے، اور یہ ہمارا شہری، آئینی، جمہوری اور دینی حق ہے، اور ہندوستان کا دستور، اور اس جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقا اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی، ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون واطمینان میں مضمر ہے۔

(Islamic Surveys : A History of Islamic Law, Edinburg 1971, P.14)(۱)

یکساں سوال کوڈ کے نفاذ کا مطالبہ (سپریم کورٹ کا ایک شگوفہ)

مگر ابھی آئینی اور حکومتی سطح پر کوئی ایسا اقدام یا خطرہ سامنے نہیں آیا تھا، جس کا کھلے طور پر نوٹس لیا جائے، اور اس خطرہ کو دفع کرنے، یا اس سے محفوظ رہنے کی منظم اور جمہوری طریقے پر کوشش کی جائے، کہ اچانک سپریم کورٹ کی طرف سے یکساں عائلی قانون کے نفاذ کا مطالبہ کیا گیا، اور حکومت کو توجہ دلائی گئی کہ وہ دستور ہند کے اس رہنما اصول کو نافذ کرے، کہ اس سے ملک میں اتحاد، معاشرت میں یکسانی اور وحدت پیدا ہوتی ہے، اور اس سے ان بعض خطرات کا ازالہ ہوتا ہے، جو بعض فرقوں (بلکہ صحیح معنیٰ میں اکثریت) کو پیش آرہے ہیں۔(۱)

سپریم کورٹ کے اس شگوفہ کو چھوڑنے سے جو دستور ہند کے بنیادی اصول اور دفعہ "مذہب میں عدم مداخلت" کے بالکل منافی اور اقلیت کے لیے ایک چیلنج ہے، مسلمانوں کو اور خاص طور پر دین کا علم اور ملی غیرت رکھنے والوں اور ان میں بھی خصوصی طور پر مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذمہ داروں کو چونکا بلکہ لرزا دیا، جنہوں نے مطلقہ کو دائمی نفقہ دینے کے خلاف مہم چلائی تھی، اور سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کو منسوخ کرانے میں جو اس نے شاہ بانو کیس میں کیا تھا، غیر معمولی اور تاریخی کامیابی حاصل کی تھی۔

سپریم کورٹ کی حکومت کو اس توجہ دہانی اور پریس میں اس کے آجانے کے بعد سے مسلمانوں میں (بلا اختلاف فرقہ واریت، حلقہ خیال اور سیاسی تنظیم و پارٹی) ایک کھل بلی سی مچ گئی، اور شاہ بانو کیس سے بھی زیادہ اس سے مذہب میں صریح مداخلت کے خطرات پیدا ہوگئے، اس لیے کہ شاہ بانو کیس صرف ایک جزئیہ سے تعلق رکھتا تھا، اور وہ مطلقہ کو دائمی نفقہ دینے کا مسئلہ تھا، جس کی شریعت اسلامی میں کوئی قید و شرط نہ تھی، لیکن یونیفارم سول کوڈ پوری شریعت اسلامی، نکاح و طلاق، تعدد ازدواج کی اجازت، نفقہ

---

(۱) ان میں سب سے زیادہ اہمیت دوسری شادی کرنے کے لیے اکثریت کے بعض افراد کے قبول اسلام کے معدودے چند واقعات کو دی گئی۔

ومیراث سب کے لیے ایک چیلنج اوران کے ازالہ وسد باب کے لیے دروازہ کھولتا تھا، اور مسلمانوں کے لیے (جو ایک مکمل آسمانی شریعت منزل من اللہ کتاب اور عادلانہ ومطابق فطرت معاشرتی قانون رکھتے ہیں) خطرہ کی ایک گھنٹی بلکہ زندگی کی پوری چلتی ہوئی گاڑی کے لیے خطرہ کا اور روکنے کا ایک سگنل تھا۔

پھر سپریم کورٹ کی یہ توجہ دہانی بالکل ایک بے وقت، بے ضرورت اور بے فائدہ کام تھا کہ اس سے ملک کے حالات میں کوئی بہتری، باہمی اعتماد کی فضا اور ملک کی تعمیر وترقی کے لیے کوئی جذبہ اور جوش نہیں پیدا ہوتا تھا، بلکہ ملک میں ایک نئے انتشار کا اندیشہ اور صف آرائی کا خطرہ تھا، اس لیے کہ کم سے کم مسلمان اپنے عائلی قانون کو (بجا طور پر) عقائد وفرائض کی طرح دین کا ایک جز اور قرآن کا ایک حصہ سمجھتے ہیں، اس عائلی قانون کی بنیادیں، اس کے اہم اجزاء قرآن مجید میں (نصوص کی صورت میں) صراحۃً موجود ہیں، پھر اس سے ملک کے مختلف فرقوں اور مذہبوں میں کسی طرح بھی اتحاد اور وحدت نہیں پیدا ہوسکتی کہ اس کا اس سے دور کا بھی تعلق نہیں، اور دن رات اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ ایک ہی عائلی قانون رکھنے والے ایک دوسرے سے برسر پیکار اور دست وگریبان ہیں۔(۱)

موجودہ صورت حال میں کرنے کے دو کام

اس سلسلہ میں کچھ فیصلے اور اقدامات ضروری ہیں، جو اس ملک میں جو آئینی

---

(۱) اگرچہ وزیر قانون نے اس کا اعلان کردیا اور اطمینان دلا دیا ہے کہ بعض ہندو احیاء پرست (جماعتوں) کے اس مطالبہ کو منظور نہیں کیا جائے گا، اور قانون کی صورت حال جو ابھی تک تھی، باقی رہے گی اور مرکزی حکومت کی طرف سے بھی بعض ایسے اشارے دیئے گئے ہیں، لیکن مسلمانوں کو بحیثیت ملت اور مسلمانوں کے عائلی قانون کے تحفظ کے مقصد کے لیے قائم ہونے والی جماعتوں بالخصوص آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو اس سلسلہ میں بیدار اور چوکنا رہنا چاہئے کہ کسی وقت بھی ہندو احیاء پرستی کے جوش میں یا سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے یہ مطالبہ زندہ ہوسکتا ہے، اور اس کے لیے کوششیں پھر سرگرم ہوسکتی ہیں، اسلامی حمیت اور خطرات کا شعور رکھنے والی جماعتوں کے لیے حکیم شاعر کا پیغام ہے۔

مکتب عشق کا دیکھا یہ نرالا دستور
اس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

حیثیت سے اوراعلان کی حدتک سیکولر (Secular) ہے لیکن عملی اورواقعاتی طور پر وہ اکثریت کے مذہب، تہذیب ومعاشرت اوررجحانات کے تابع ہوتا جارہا ہے، اور یہاں تدریجی طور پر ملک کا رُخ اکثریت کے ترجمان وپسندیدہ نظام تعلیم، طرزعمل اور عائلی قوانین ورسوم کی طرف پھیرا جارہا ہے۔

۱۔ پہلا ضروری اقدام وفیصلہ یہ ہے کہ اس ملک میں جابجا شرعی دارالقضاء قائم ہوں، جہاں سے عائلی اختلافات وتنازعات اورواقعات وحوادث کا شرعی فیصلہ معلوم کیا جائے اوراس پر عزم وخلوص اوردیانتداری کے ساتھ عمل کیا جائے، اس سے مسلمان خاندان اس طوالت، مصارف کثیر اورسب سے بڑھ کر شریعت کی مخالفت کے امکان وخطرہ سے بچ جائیں گے، جس کا عدالتی فیصلوں سے خطرہ ہے اوراس کے بار بار تجربے ہو چکے ہیں، پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شرعی فیصلہ پر فریقین اکثر راضی ہوگئے ہیں اورایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے ہیں، اوروہ محاذ آرائی ختم ہوگئی ہے، جو اس سے پہلے موجود تھی، پھر اس سے ان کو وہ اجروثواب ہوتا ہے، جو حکم خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم جھکا دینے سے حاصل ہوتا ہے، اوروہ خدا کے حکم سے اس سرتابی اور بغاوت سے بچ جاتے ہیں، جس کے بارہ میں قرآن مجید کے صاف الفاظ ہیں:۔

"وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ".

(سورة المائدہ:۴۷)

اور جو کوئی اللہ کے نازل کیے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔

اس سلسلہ میں اسلام کے عائلی قانون پر کتاب کی تدوین مکمل ہو چکی ہے، اورضرورت ہے کہ وہ جلد زیورطبع سے آراستہ ہو اوراس کا انگریزی وہندی میں ترجمہ بھی ہوجائے اوراسی کی روشنی میں ایسی شرعی عدالتوں "اسلامی دارالقضاء" میں فیصلے ہوں۔

۲۔ دوسرا کام "اصلاح معاشرہ" کا کام ہے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ اسلام صرف چند عقائد وفرائض اور عبادات مفروضہ کی ادائیگی میں محدود نہیں، وہ ایک پورا نظام حیات ومعاشرہ ہے، جس کا تعلق دونوں انسانی جنسوں (ذکور واناث) اور ہر عہد اور ہر ملک کے مسلمانوں سے ہے، مسلمانوں کی زندگی اور معاشرت (اپنے تمام اقسام ومراحل کے ساتھ) شریعت کے اس سانچہ میں ڈھلی ہونی چاہئے، جو اللہ کے آخری رسولؐ قیامت تک کے لیے لے کر آئے اور جس کے متعلق واضح الفاظ میں اعلان کردیا گیا کہ:۔

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا". (المائدہ:۳)

آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کردیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین کے پسند کرلیا۔

اور اسی حکمت کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ہر نبی کو انسانی لباس میں (بشر کی حیثیت سے) بھیجا تا کہ وہ اپنی امت، متبعین، اور اپنے ملک ومعاشرہ اور اپنے عہد کے زندہ انسانوں اور مختلف الانواع طبقات کے لیے نمونہ اور مثالی وقابل تقلید ہستی بنے، خود سید المرسلین وخاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نوع بشر کے لیے اسوۂ کامل بنا کر بھیجا اور آپ کو ان تمام مراحل اور زندگی کے شعبوں سے گزارا، جو انسانی زندگی کے فطری وضروری شعبے ہیں، یعنی صحت ومرض، شباب وکہولت، فراغت ومجاہدہ، صلح وجنگ، ازدواجی زندگی، اولاد کی پیدائش بھی اور ان میں سے بعض کی وفات بھی، پھر بعض دختران خاندان نبوت کے فریضۂ ازدواج کی ادائیگی، پھر ان سب مراحل وشعبوں کے بارے میں (حدیث وسیرت کے ذریعہ) مستند ترین معلومات مہیا کرنے اور محفوظ رکھنے کا غیبی انتظام فرمایا، جس کی مثال صالحین ومتقین، مصلحین ومعلمین کا کیا ذکر، گذشتہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں بھی نہیں ملتی، اور پھر اس سب کے بعد فرمایا:۔

"لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا

اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الآخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْراً". (سورۃ الاحزاب: ۲۱)
رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے تمہارے لیے یعنی اس کے
لیے جوڈرتا ہواللہ اور روز آخرت سے اور ذکر الٰہی کثرت سے کرتا ہو۔

پھر اس کے بعد آپ ہی کی حیات طیبہ مبارکہ میں دارالہجرہ مدینہ میں وہ اسلامی معاشرہ قائم کیا، جو زندگی، قدرت واستطاعت، فراغت وعسرت، شباب وکہولت، خاندانی وقبائلی اختلافات، ذوق وصلاحیت کے تنوع کے ساتھ ایک زندہ، متحرک، حساس، عمل واختیار کی صلاحیتوں کے تنوع کے ساتھ آپ کی حیات طیبہ میں دس سال تک، اور آپ کی وفات کے بعد خلافت راشدہ کے عہد میں ایک مثالی معاشرہ تھا، اس میں قدرۃً وفطرۃً شادیاں بھی ہوتی تھیں، نکاح بھی ہوتے تھے، اور طلاق بھی، بیٹی کو نکاح کے بعد رخصت بھی کیا جاتا تھا، اور بہو کو بیاہ کر گھر بھی لایا جاتا تھا، مہر بھی معین ہوتا تھا، اور کسی نہ کسی شکل ومقدار میں جہیز بھی دیا جاتا تھا، والدین کے انتقال کے بعد میراث بھی تقسیم ہوتی تھی، اور املاک وجائداد میں حصہ بھی دیا جاتا تھا، تجارت، زراعت اور انواع معیشت میں مشارکت وحصہ داری بھی ہوتی تھی، غرض زندگی اپنے پورے تنوع کے ساتھ موجود تھی اور مستند ترین تاریخی ذرائع (تاریخ ومستند ومتواتر روایات کے ذریعہ) اس کی ایسی تصویر محفوظ ہے، جس میں اس سب کے نمونے انواع والوان، مظاہر ومناظر دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جو عشرۂ مبشرہ میں ہیں، مہاجر ہیں اور قبیلۂ قریش سے تعلق رکھتے ہیں، اور اس کا پورا امکان ہے کہ اوپر ان کے خاندان کے اور بنی ہاشم (خاندان رسالت) کے رشتے بھی ہوئے ہوں، ایک دن معمول کے مطابق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو آپؐ ان کے لباس میں عطر کی ایسی خوشبو پاتے ہیں، جو عام طور پر اس سے پہلے نہیں ہوتی تھی، آپؐ سوال فرماتے ہیں کہ عبدالرحمٰن! کیا بات ہے، آج تمہارے کپڑوں میں بہت عطر لگا ہوا ہے؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ یارسول اللہؐ! میں نے نکاح کیا ہے، اس پر حدیث وروایات کی کسی کتاب میں یہ نہیں ملتا کہ آپؐ نے شکایت واستعجاب کا کوئی لفظ فرمایا ہو کہ عبدالرحمٰن! اتنی جلدی یہ بے تعلقی یا بے مروتی، تم نے ہمیں خبر بھی

نہیں کی اور نہ دعوت دی، اور نہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے معذرت و شرمندگی کا کوئی جواب منقول ہے، حالانکہ یہ مسلم ہے اور تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ یثرب (جواب مدینہ طیبہ ہے) کوئی ایسا بڑا شہر نہیں تھا، جہاں اطلاع دینے کے لیے کوئی بڑا فاصلہ طے کرنا پڑتا اور یہ بھی ایک تجربہ اور مشاہدہ کی بات ہے کہ ایک شہر یا ایک نسل و پیشہ کے لوگ جب ترک وطن کر کے کسی دوسرے ملک یا شہر میں جاتے ہیں تو عام طور پر قریب ہی رہتے ہیں، اس لیے کہ وہ ایک دوسرے کے مزاج اور روایات سے واقف ہوتے ہیں، اور خواتین کو بھی ایک دوسرے سے ملنے جلنے میں آسانی ہوتی ہے، آپؐ یہ سننے کے بعد کہ عبدالرحمٰن بن عوف نے نکاح کیا، صرف یہ فرماتے ہیں کہ ''اولم ولو بشاۃ'' (دیکھو ولیمہ ضرور کرنا، چاہے ایک بکری کا ہو)

یہ واقعہ اور روایت اس پر پوری روشنی ڈالتی ہے کہ عقد و نکاح کوئی ایسی ہنگامہ خیز اور زلزلہ انگیز تقریب یا واقعہ نہیں ہے کہ سارے شہر کو، پوری برادری کو، اور اہل تعلق کو اس کی خبر کی جائے، اور ان کو مدعو کرنا ضروری سمجھا جائے ورنہ یہ سخت قابل شکایت بات ہوگی اور پھر اس میں ایسے اہتمام اور ایسی دھوم دھام سے کام لیا جائے، جس سے نکاح کرنے والے یا اس کے سرپرست و خاندان کی حیثیت عرفی (Social Position) کا اظہار و تعین ہو۔

مدینۂ طیبہ کی اس مثالی اور معیاری معاشرہ اور طرز زندگی کے بعد عرصۂ دراز تک (جب تک مسلمان بیرونی تمدنوں اور طرز معاشرت سے متاثر نہیں ہوئے اور ان میں اظہار شان و شوکت کی بیماری نہیں آئی) یہی طرزِ نکاح و ازدواج اور اس کی سادگی اور محدودیت قائم رہی، عام طور پر مساجد میں نکاح ہوتے تھے، بعض مرتبہ کسی نماز کے بعد اچانک اعلان کر دیا جاتا تھا کہ نماز کے بعد حاضرین تشریف رکھیں، فلاں کا نکاح ہوگا، اکثر خاندان کے تمام افراد کو بھی اس کی پہلے سے خبر نہیں ہوتی تھی (۱)۔

---

(۱) ریاست ٹونک میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان کے وہ لوگ، جو صوبہ سرحد سے زندہ سلامت واپس آئے تھے، اور دوسرے افراد خاندان، ان کے وطن ''رائے بریلی'' سے آ کر بس گئے تھے، اور اسی وجہ سے اس محلّہ کا نام ''قافلہ'' پڑ گیا، یہی دستور تھا۔

معذرت کے ساتھ بطور لطیفہ کے لکھا جاتا ہے کہ ابھی حال میں راقم سطور نے لکھنؤ کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد جمعہ ختم ہونے پر دو ہیں منبر پر بیٹھ کر بیس نکاح پڑھائے اور یہ سب کام بغیر کسی شور و ہنگامہ کے ایک گھنٹہ کے اندر ختم ہو گیا۔

لیکن جب مسلمان ان ملکوں میں جا کر بسے، جہاں دوسرا نظام معاشرت، طریقہ شادی وغمی اور طرزِ زندگی رائج تھا، جس میں عزت وافتخار، شہرت وناموری اور حب جاہ کا جذبہ کام کررہا تھا، یا وہ اس ملک کے قدیم روایات کے مطابق تھا، جس میں دین ومذہب کا کم اور رسم ورواج کا زیادہ دخل تھا، اور جو وہاں کے مذاہب کے علم برداروں اوراجارہ داروں کے تساہل وتغافل اور ایک حد تک تعاون کا نتیجہ تھا تو مسلمان جن کو اس معاشرہ وماحول پر اثر ڈالنا چاہیئے تھا اوراس کی اصلاح کرنی چاہیئے تھی، وہ الٹے اس معاشرہ وماحول اور طرزِ زندگی سے متاثر ہوئے اورانہوں نے نکاح کے اس مسنون فریضہ کو، جو نہایت سادگی اور سہولت سے ادا کیا جا سکتا تھا، ایک ''ہفتخوان'' سر کرنے کے مرادف بنادیا، جس کے لیے بعض اوقات سودی قرض لینے، املاک کو فروخت کرنے یا رہن رکھنے کی نوبت بھی آجاتی ہے، اوروہ تمام قبائح ومنکرات اس میں شامل ہوجاتے ہیں، جن سے شریعت نے روکا ہے، اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دین وشریعت کے صحیح ترجمانوں نے ان کی مذمت کی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ مذمت اور لائق توجہ مسئلہ زیادہ سے زیادہ جہیز دینے کے مطالبہ کا ہے، جس کو خود مسلمانوں نے اختیار کرلیا ہے، کہیں اس کا نام ''تلک'' ہے، کہیں ''گھوڑا جوڑا'' اس کے سلسلے میں وہ قابل مذمت اور لائق نفرت اقدامات بھی پیش آنے لگے ہیں اور بیاہی خاتون کے ساتھ احتیاج اور مقاطعہ کے وہ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں، جو نہ صرف شرعاً واخلاقاً مذموم ہیں بلکہ دور وحشت وجاہلیت کی یادگار ہیں، جب دولت کی معبود کی طرح پرستش ہوتی تھی، اوراس کے حصول کے لیے سب کچھ جائز سمجھا جاتا تھا۔

پھر اسی طرح طلاق کے بارے میں، ترکہ کی تقسیم ومیراث کے بارے میں، رفیقہ حیات کے حقوق کی ادائیگی اور معاشرت کے بارے میں بہت سی کوتاہیاں مسلمانوں کے معاشرہ اور عائلی زندگی میں ایسی داخل ہوگئی ہیں جنہوں نے اسلامی معاشرہ کا امتیاز اور وقار کھودیا ہے، اور کثیر التعداد مشکلات پیدا کردی ہیں، جو محض اس شریعت سے روگردانی اور ناواقفیت کا نتیجہ ہے، جو ایک نعمت خداوندی کے طور پر انسانوں کو دی گئی تھی۔

ان حقائق کے پیش نظر جنھوں نے اسلام کی عمومیت، ابدیت، مطابق فطرت ہونے اور نعمت خداوندی ہونے پر پردہ ڈال دیا ہے، اور مسلمان معاشرہ کو صدہا مشکلات میں اور قبائح میں مبتلاء کر دیا ہے، ایک عالمگیر تو نہیں، لیکن ہند گیر مہم چلانے کی ضرورت ہے، یہ کام ''اصلاح معاشرہ'' کے عنوان سے مسلم پرسنل لا بورڈ نے شروع سے اپنے پروگرام میں داخل اور اپنے فرائض میں شامل کیا تھا، اس سلسلہ میں پٹنہ میں، لکھنؤ میں، میرٹھ اور بستی میں اور بعض دوسرے مقامات پر ''اصلاح معاشرہ'' کے نام سے کامیاب اور کثیر الازدہام کانفرنسیں ہوئیں، جن میں پوری طاقت وتاثیر کے ساتھ عقائد وفرائض اسلام کی پابندی کے ساتھ، اس کے معاشرتی نظام اور عائلی زندگی کے احکام کو قبول کرنے اور ان پر پورے عزم وقوت کے ساتھ عمل کرنے کی دعوت دی گئی، اور صفائی کے ساتھ اس آیت کی روشنی میں مکمل مسلمانوں کو کامل اسلام کے قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔

"يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَلَاتَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ". (سورة البقرہ: ۲۰۸)

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ، اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔

ضرورت ہے کہ یہ کام ہند گیر پیمانہ پر ہو، جا بجا ''اصلاح معاشرہ'' کے وسیع ومؤثر جلسے ہوں، اس میں صوبہ گجرات کے، جس کے شاندار علمی ودینی تاریخ اور اس کے اس امتیاز وتفوق کا ذکر، خطبہ کی ابتدا میں آچکا ہے، جو اس کو صرف اس برصغیر میں نہیں بلکہ (ایک طویل عرصہ تک) عالم عربی واسلامی میں حاصل رہا ہے، ہر طرح شایان شان، قرین قیاس اور حسب توقع ہے، واللہ الموفق والمعین۔

آخر میں میں اس اعزاز کے لیے، جو صدارت کی شکل میں ناچیز کو حاصل ہوا، اور اس توجہ والتفات اور حسن استماع کے لیے جس کا موقر حاضرین جلسہ نے اظہار کیا، اللہ

تبارک وتعالیٰ کا شکر اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

الحمد للّٰہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللّٰہ لقد جاء ت رسل ربنا بالحق.

مسلمان اپنے دین کے ایک نقطہ سے بھی دست بردار
نہیں ہوسکتا!

خطبۂ صدارت

اجلاس سیزدہم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

منعقدہ بمبئی ۲۸، ۲۹، ۳۰/ اکتوبر ۱۹۹۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبین محمد والہ وصحبہ اجمعین ومن تبعھم باحسان ودعا بدعوتھم الی یوم الدین.

حضرات سامعین کرام!

ہم مسلمانوں نے پورے عزم کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنے وطن ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے، ہمارے اس فیصلہ کو ارادۂ الٰہی کے سوا کوئی طاقت نہیں بدل سکتی، ہمارا یہ فیصلہ کسی کم ہمتی، مجبوری، یا بے چارگی پر مبنی نہیں ہم نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔

ہمارا دوسرا فیصلہ یہ ہے (جو اپنے عزم اور قطعیت میں پہلے فیصلہ سے کسی طرح کم اور غیر اہم نہیں) کہ ہم اس ملک میں اپنے پورے عقائد، دینی شعائر، قانون شریعت اور اپنی پوری مذہبی وتہذیبی خصوصیات کے ساتھ رہیں گے، ہم ان کے کسی ایک نقطہ سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں۔

اس ملک کے باشندے کی حیثیت سے ہمیں یہاں آزادی اور عزت کے ساتھ رہنے کا پورا حق حاصل ہے، یہ اس ملک کی جمہوریت اور دستور وآئین کا بھی فیصلہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اپنی خصوصیات، قانون شریعت، احکام دین، اپنے عقائد وشعائر اپنی زبان وتہذیب اور اپنی ان چیزوں کو چھوڑ کر جو ہم کو عزیز ہیں اس ملک میں رہیں، اس طرح رہنے سے یہ وطن، وطن نہیں بلکہ ایک جیل خانہ اور قفس بن جاتا ہے، جس میں گویا پوری قوم کو زندگی کی عزتوں اور لذتوں سے محروم رکھ کر سزا دی جاتی ہے، ہمارا خمیر ضرور اس ملک سے تیار ہوا ہے اور یہ خاک ہم کو بہت عزیز ہے، لیکن ہماری تہذیب ابراہیمی ہے اور مسلمان جس ملک میں رہے گا اس کی وطنیت خواہ کچھ ہو، اس کی

تہذیب ابراہیمی ہوگی ہم یہاں زندہ اور باعزت انسانوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں، ہم اس ملک میں آزاد ہیں، اس کی تعمیر وترقی اور دستور سازی میں شریک ہیں، اس لئے اس کا کوئی سوال نہیں کہ ہم دوسرے درجہ کے شہریوں کی طرح زندگی بسر کریں، اپنے ملک میں آزادی کے ساتھ زندگی گزارنا ہر شخص کا فطری انسانی، اخلاقی اور قانونی حق ہے اور اس حق کو جب بھی چھیننے کی کوشش کی گئی تو اس کے ہمیشہ سنگین نتائج نکلے۔

زندگی اور موت بھی اسلام پر ہوگی، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ اسلام اور ایمان پر قائم رہنے کی کوشش کریں، اسی پر اپنی زندگی گزاریں اور جب موت آئے تو اسی دین وملت پر آئے۔

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ. (آل عمران:۱۰۲)

(تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔)

اسی کی وصیت ابراہیم ویعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کی کی کہ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ط يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ. (البقرہ: ۱۳۲)

اسی طریقہ پر چلنے کی ہدایت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو تھی اور اس کی وصیت یعقوب نے اپنی اولاد کو کی، انہوں نے کہا تھا، میرے بچو! اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند کیا ہے لہذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔

شریعت اسلامی نے ایک مسلمان کے لئے پیدائش سے لے کر موت تک اس کے انتظامات کئے ہیں اور ایسا ماحول تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے جس میں مسلمان اس حقیقت کو فراموش نہ کرنے پائے، اس کو ہر وقت یاد رہے کہ اس کا تعلق اس دین وملت سے ہے جس کے داعی ابراہیم اور محمد علیہما السلام تھے جس کی بنیاد توحید پر ہے اور وہ ایک الگ امت ہیں، مسلمان جس وقت بھی پیدا ہوتا ہے، اس کے کان میں اذان دی جاتی ہے، اس کا

اسلامی نام رکھا جاتا ہے، ناموں میں ان ناموں کو ترجیح دی گئی ہے جن میں عبدیت وحمد کا اظہار ہے، اس سے ابراہیمی سنتیں ادا کرائی جاتی ہیں اور جب مرتا ہے تو سب اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہوئے اپنے لیے اور سب مسلمانوں کے لئے دعا کرتے ہیں۔

اللّٰھم من احتییته منا فاحیه علی الاسلام و من توفیته منا فتوفه علی الایمان.

(اے اللہ ہم میں سے تو جس کو زندہ رکھے اس کو اسلام پر زندہ رکھیو اور جس کو موت دے تو اس کو ایمان کے ساتھ دنیا سے اٹھائیو)

یہاں تک کہ قبر میں اتارتے ہوئے اور آخری ٹھکانے پر پہنچاتے ہوئے بھی یہی لفظ زبان پر ہوتے ہیں۔

بسم اللّٰہ وعلیٰ ملة رسول اللّٰہ، اللہ کے نام پر اور رسول اللہ کے دین وملت پر، اس کا مقصد اور پیغام یہ ہے کہ ہمیں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اور زندگی کی ہر منزل پر اس کو یاد رکھنا ہے کہ ہم ملت ابراہیمی اور امت محمدی کے فرد اور ایک مخصوص شریعت اور آئین ومسلک زندگی کے پیرو اور خدا کے موحّد اور وفادار بندے ہیں، ہماری زندگی بھی اسی آئین ومسلک کی وفاداری میں گزرے اور ہمیں موت بھی اسی حال میں آئے، ہماری موجودہ نسلیں بھی اسی راستہ پر گامزن رہیں اور ہماری آئندہ نسلیں بھی اسی صراط مستقیم پر چلیں۔

ملت ابراہیمی اور دین محمدی کی اس دعوت کو آج صراحت اور تعین کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہے، یہ اس تہذیب کی دعوت ہے جس کی بنا ابراہیم علیہ السلام نے ڈالی ہے اور تکمیل وتجدید حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، اجتماع واخلاق میں اس کے معین اصول ہیں، یہ فرد کی حریت اور فلاح کی ضامن ہے، چند معین عقائد، معین اصولوں اور معین کرداروں نے اس کو وجود بخشا ہے، یہ ابراہیم علیہ السلام ومحمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشترکہ دعوت اور میراث ہے اور اس کے سوا کوئی تیسری چیز خدا کو قبول نہیں۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

(اقبالؒ)

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے ایمان وعقیدہ کا جزء ہے کہ ان کا عائلی قانون (Family law) اسی خدا کا بنایا ہوا ہے جس نے قرآن اتارا اور عقائد وعبادات کا قانون عطا کیا، سارا قرآن مجید ان تصریحات سے بھرا ہوا ہے، مسلمان اس عقیدہ پر ایمان لانے پر مجبور ہیں اور اس کے بغیر وہ مسلمان نہیں رہ سکتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون خدائے علیم وخبیر کا بنایا ہوا ہے، جو انسان کا بھی خالق ہے اور اس کائنات کا بھی، وہ فطری ضرورتوں اور کمزوریوں دونوں سے واقف ہے، وہ فرماتا ہے۔

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ. (الملك: ۱٤)

کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے وہ تو (بڑا ہی) باریک بیں اور (پورا) باخبر ہے۔

اسی طرح وہ زمانہ کا خالق ہے، ہمارے لحاظ سے ماضی وحال ومستقبل کی تقسیم کتنی ہی صحیح اور ضروری ہو اس کے لحاظ سے سب ماضی ہی ماضی ہے، اس لئے ایک بار یہ مان لینے کے بعد وہ خدا کا بنایا ہوا قانون ہے جو ایک زندہ جاوید امت اور ایک عالمگیر اور دائمی شریعت کے لئے بنایا گیا ہے تو ترمیم وتبدیلی کی ضرورت کا مطالبہ ایک کھلے منطقی تضاد اور جہاں تک مسلمان کہلانے والے اشخاص کا تعلق ہے) ایک اعتقادی وعلمی نفاق کے سوا کچھ نہیں، پھر معاملہ صرف ایمان بالغیب اور مذہبی عقیدت اور عصبیت کا نہیں، اس قانون کے مکمل متوازن اور عادل ہونے اور زمان ومکان کی تبدیلی پر حاوی ہونے کے عقلی وعلمی شواہد اور مسلم وغیر مسلم، مشرقی ومغربی فضلاء، جری وانصاب پسند مقننین کے واضح اعترافات اور عملی تجربے اتنے ہیں کہ کوئی ''شپرہ چشم'' ہی ان سے انکار کرسکتا ہے، اس

موضوع پر متعدد نامور فضلاء نے قلم اٹھایا ہے اور بڑا قیمتی مواد جمع کر دیا ہے۔

ہندوستان میں جب یہ مسئلہ اٹھا اور دیکھنے والوں کو یہ نظر آیا کہ افق پر خطرہ کی علامتیں نمایاں ہوگئی ہیں اور یہ بادل جو ابھی کسی وقت گرجتا ہے کسی وقت ضرور برسے گا تو انہوں نے ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے نام سے دسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں ایک متحدہ پلیٹ فارم بنایا جس سے وقتاً فوقتاً قانون سازی کی نوعیت اور اس کے رخ کا جائزہ لیا جاتا رہے، اور مسلمانوں کی رائے عامہ کو بیدار رکھنے کا سامان کیا جاتا رہے، تاکہ اچانک ان پر یہ یا کوئی دوسرا مسئلہ شب خون نہ مارنے پائے یہ ایک ایسا نمائندہ بورڈ تھا جس کی مثال اپنی وسعت اور عمومیت اور مختلف مکاتب خیال کی نمائندگی کے لحاظ سے تحریک خلافت کے بعد نہیں ملتی، ۱۹۴۷ء کے بعد اتنے بڑے اجتماعات دیکھنے میں نہیں آئے، اس بورڈ کی تشکیل اور اس کے ان شاندار اور بے نظیر جلسوں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ حکومت اور مسلم پرسنل لا میں اصلاح وترمیم کی آواز بلند کرنے والے حضرات کو ہوا کا رخ معلوم ہوگیا، اور اتنا ثابت ہوگیا کہ مسلمان اس مسئلہ پر صد فیصد متفق ہیں، اس لئے دانش مندی، حقیقت پسندی اور انتخابی سیاست کا بھی تقاضا ہے کہ اس مسئلہ کو اٹھانے میں احتیاط کی جائے۔

حضرات! یہ دین جو ہم تک پہنچا ہے اور جس دولت کے ہم آپ امین اور (محافظ کا لفظ تو بہت بڑا ہے) اس دولت کے حامل ہیں، وہ دین ہمیں دانشوروں، سماجی خدمت گاروں، اصلاحی کام کرنے والوں (ریفارمرس (Reformers) یا بانیان سلطنت کے ذریعہ نہیں پہنچا ہے، یہ سارے گروہ قابل احترام ہیں، لیکن کسی دین میں اور کسی تہذیب، نظام فکر ودبستان خیال (School of Thought) اور خالص مطالعہ، غور وفکر اور تجربہ کے نتائج میں ایک حد فاصل، سرحدی لکیر (Line of Demarcation) ہوتی ہے جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے، اس خط کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، حد فاصل یہ ہے کہ آسمانی مذاہب (ادیان) ان برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہنچے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا، اور جن پر وحی آتی تھی، اس نکتہ کو نہ

سمجھنے کی وجہ سے خلط مبحث (Confusion) ہوتا ہے، زیادہ تر لوگ نادانستہ طریقہ پر ان مذاہب سے توقع اور بعض اوقات آگے بڑھ کر ایسی چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں جن کی ان مذاہب میں گنجائش اور ان کا کوئی جواز نہیں وہ بعض اوقات ان کی تشریح کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے ہیں، اپنی وسعت مطالعہ اور وسعت اظہار کے لئے وہ مذاہب کی ترجمانی ایسی کرنے لگتے ہیں جیسے کہ یہ نرے فلسفے یا انسانوں کے بنائے ہوئے تہذیب وتمدن کے نظام اور سماجی تجربے اور معاشرتی نظریات ہیں، یہ ہے وہ غلطی جو نادانستہ طریقہ پر بعض بڑے ذمہ دار اور سنجیدہ لوگوں سے ہوتی ہے وہ یہ نہیں جانتے کہ دین اور غیر دین میں حد فاصل اور امتیازی نشان کیا ہے؟ فلسفۂ سماجیات (Socal Scince) کا علم تہذیب وتمدن (Civilization) سوسائٹی اور انسانی معاشرہ یہ سب اپنی جگہ حقائق ہیں، ہم ان کا انکار نہیں کرتے، ان کا احترام کرتے ہیں اور اپنے ذمہ ان کے حقوق سمجھتے ہیں، خود مسلم ملت ایک معاشرہ، تہذیب وتمدن اور فکر ودانش کا ایک مستقل مدرسہ (School of Thought) بھی ہے لیکن اس کی جو اصل حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک ''دین'' ہے اور اس دین کو دنیا میں پیش کرنے والے اور اس کو بروئے کار لانے والے، اس کو ہماری زندگی میں داخل کرنے والے انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام ہیں اور یہ ان کی زبان اور ان کا طرز فکر نہیں، اس کا بنیادی چشمہ ان کے دماغ میں نہیں تھا بلکہ ان سے باہر اور ان سے بلند تھا اور وہ ان کے لئے اسی درجہ کا قابل احترام اور قابل اطاعت تھا، جیسے ہمارے آپ کے لئے اور سارے امتیوں کے لئے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوىٰ، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى. (سورۃ النجم:۳،۴)

اور وہ خواہش نفس سے منہ سے بات نہیں نکالتے ہیں یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے (اوران کی طرف بھیجا جاتا ہے)

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَاالْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُوراً نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ط وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. (الشوریٰ:۵۲)

آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب (اللہ) کیا چیز ہے نہ یہ خبر تھی کہ ایمان (کا انتہائی کمال) کیا چیز ہے، لیکن ہم نے اس (قرآن) کو ایک نور بنایا جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ ایک سیدھے رستہ کی ہدایت کر رہے ہیں۔

وحی نبوت کا فرق اساسی فرق ہے، ہمیں غیر مسلم بھائیوں اور غیر مسلم فضاء سے زیادہ شکوہ نہیں کہ وہ وحی ونبوت کے عہد سے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ ان کے مفہوم سے بہت سے حضرات نا آشنا ہیں، بعثت محمدی سے پہلے خود عربوں کا یہی حال تھا، اس میں نہ کسی ذہانت کا انکار ہے اور نہ کسی کی نیت پر حملہ ہے، ایک تاریخی یا نفسیاتی تجزیہ ہے کہ جو شخص نبوت اور وحی کی حقیقت سے واقف نہیں اور یہ نہیں جانتا کہ اس کا کیا مرتبہ ہے اور حق ہے اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ کس چیز کی متقاضی ہے، وہ مسلمانوں کے بارہ میں مشورہ دینے یا فیصلے کرنے کے اخلاقی یا قانونی طور پر مجاز نہیں۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ دین اسلام کے دائرہ کو سمجھ لیا جائے، اس بارہ میں مذاہب میں خود اختلاف ہے اور اس میں درجوں کا فرق ہے، کئی مذاہب ایسے ہیں کہ وحی ونبوت سے ان کا آغاز ہونے کے باوجود انہوں نے مذہبی زندگی کو ایک خاص دائرہ میں محدود کر لیا ہے، مثلاً عبادات کے دائرہ میں، لیکن اسلام کا معاملہ یہ نہیں ہے، اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے، یہ ایک اساسی حقیقت ہے جو عبد و معبود کے تعلق کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی، ہر مسلمان خدا کا فرمانبردار بندہ ہے اور اس کا تعلق خدا سے دائمی ہے، عمومی ہے، عمیق ہے اور وسیع بھی ہے، محدود بھی ہے اور جامع بھی، قرآن شریف میں ہے:۔

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ص وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ ط إِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ. (سورہ بقرہ:۲۰۸)

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔

میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان اگر مسلم پرسنل لا (شرعی، عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کرلیں گے تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے، اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ نفسیات اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت وتہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی، اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر ومحفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اپنے عائلی وخاندانی روابط وتعلقات میں مسلمان نہیں، حقوق کی ادائگی اور ترکہ کی تقسیم میں مسلمان نہیں، اس لئے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت، نظام تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اس کو دعوت ارتداد سمجھتے ہیں اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے جیسے دعوت ارتداد کا مقابلہ کرنا چاہئے اور یہ ہمارا شہری، جمہوری اور دینی حق ہے اور ہندوستان کا دستور اور جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقا اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون واطمینان میں مضمر ہے۔

یہاں سے یہ عہد کرکے جایئے کہ اب قانون شریعت پر آپ چلیں گے، یہ جہیز کی کیا مصیبت ہے؟ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کئے جاتے ہیں، ان کے پورا نہ ہونے پر یہ معصوم لڑکیاں جلادی جاتی ہیں، ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں، صرف دہلی میں ہر بارہ گھنٹے پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے، (۱) کیا اس کائنات کے خالق اور نوع انسانی کے مربی (جس کی مخلوق مرد وعورت دونوں ہیں) کو یہ چیز گوارا ہوسکتی ہے؟ کیا اس ظلم کے ساتھ کوئی

---

(۱) ''قومی آواز'' دہلی، ۱۰ر جون ۱۹۸۴ء

ملک، کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے؟ خدا کی رحمت ونصرت کا مستحق ہوسکتا ہے؟ آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی ہمت نہیں ہونا چاہئے تھی میں نے دہلی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ط وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ. (الانفال:۳۳) اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے انہیں عذاب دیتا اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور وہ انہیں عذاب دے۔

آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہندوستانی سماج میں ہندوستان کے معاشرہ اور سوسائٹی میں یہ ظلم ہوا؟ اس کو عقل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، آپ کے ہوتے بھی یہ نہیں ہونا چاہئے تھا، چہ جائے کہ آپ کے ہاتھوں ہو، عہد کیجئے کہ آپ اسلامی طریقہ پر شریفانہ انسانی طریقہ پر شادی کا پیام دیں گے، آپ لڑکی مانگیں گے، اپنے لئے رفیقۂ حیات کی تلاش کریں گے، بیٹے کے لئے پیام دیں گے تو جہیز کے لئے آپ کے بڑھے چڑھے مطالبات نہیں ہوں گے کہ ہمیں یہ ملنا چاہئے، وہ ملنا چاہئے، لڑکوں کو اور ان کے وارثوں اور بزرگوں کو اس کا عہد کرنا چاہئے کہ ہم اپنے یہاں تو کیا ہم اس ملک سے رسم کو ختم کر دیں گے۔

☆☆☆